شاہد احمد دہلوی

بزمِ خوش نفساں

qasarulkutub.blogspot.com

بزم خوش نفساں

(شخصی خاکے)

شاہد احمد دھلوی

مرتبہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

qasarulkutub.blogspot.com

انتساب

میری اپنی بھابھی

محترمہ عاصمہ بیگم شاہد احمد دہلوی

کے نام

جمیل جالبی

qasarulkutub.blogspot.com

ترتیب

اس کتاب کے بارے میں — ڈاکٹر جمیل جالبی - ۷

شاہد احمد دہلوی — ڈاکٹر جمیل جالبی - ۱۱

صاحب طرز ادیب — ڈاکٹر جمیل جالبی - ۲۷

مولوی عبدالحق - ۳۵

مولانا عبدالسلام نیازی - ۴۹

شوکت تھانوی - ۵۹

مولانا نیاز فتحپوری - ۷۴

فیض احمد فیض - ۸۰

مولانا صلاح الدین احمد - ۸۹

علامہ راشد الخیری - ۱۰۹

قاری سرفراز حسین - ۱۱۷

آغا شاعر قزلباش - ۱۲۶

کرشن چندر - ۱۳۳

حفیظ جالندھری - ۱۴۵

ڈپٹی صاحب (انتصار حسین) - ۱۶۵

نفاست حسین - ۱۷۴

qasarulkutub.blogspot.com

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
میر باقر علی داستان گو۔ ۱۸۹
میر غالب دہلوی۔ ۱۹۳
شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن۔ ۱۹۴
خواجہ ناصر نذیر فراق۔ ۱۹۶
نواب سائل دہلوی۔ ۱۹۹
مولوی احتشام الدین۔ ۲۰۱
مرزا چپاتی۔ ۲۰۳
نواب تاباں۔ ۲۰۶
ملّا واحدی۔ ۲۰۷
پنڈت امرناتھ ساحر۔ ۲۰۸
خلیقی دہلوی۔ ۲۰۹
مرزا حیرت دہلوی۔ ۲۱۰
نہال سیوہاروی۔ ۲۱۱
شاہد احمد دہلوی۔ کوائف و تصانیف۔ ۲۱۴

اِس کتاب کے بارے میں

۱۹۴۷ء میں "آزادی" آئی تو خون کی ہولی کھیلتی ہوئی آئی۔ لاکھوں انسان، معصوم و بے قصور انسان، موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ صدیوں پرانی آبادیاں اُجڑ گئیں اور کروڑوں کی تعداد میں لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر، صرف یادوں کا سرمایہ لیے، ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے گئے۔ جو تھا وہ نہ رہا اور جو رہا، وہ اب کچھ اور تھا۔ تہذیبوں کے رُوپ بدل کر ستے رُوپ اختیار کرنے لگے۔ یہ سب کچھ میری نسل کا ایک اَن مٹ تجربہ اور ہمارے شعور کا ایک زندہ حصّہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب زخم بھرنے لگے، احساسِ درد کم ہوا اور کرب کی چبھن دبنے لگی تو ان یادوں نے سر اُٹھانا شروع کیا جو شعور کے نہاں خانے میں سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ مَیں نے شاہد احمد دہلوی کی زبانی ان یادوں کی دِل چسپ کہانیاں سُن کر کہا کہ "اگر وہ انھیں لکھ دیں تو یہ سب محفوظ ہو کر ہمارے ادب، ہمارے ماضی، ہماری تاریخ اور اِس دَور کی رُوح کی ترجمان بن جائیں گی۔"

اُن زمانے میں یادوں کا اظہار اُن کا روزمرّہ بن گیا تھا۔ وہ گھنٹوں بیتے دِنوں کی یادوں کو تازہ کرتے رہتے۔ اور مَیں اُن سے کہتا۔ "شاہد بھائی! یہ سب کچھ لکھ دیجیے۔" اس بات کو کئی مہینے گزر گئے۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ان یادوں کو سمیٹنے کے لیے قلم اُٹھایا اور ان کا پہلا مضمون "خمریاتِ خیال" کے نام سے ماہنامہ "ساقی" کراچی کے جنوری و فروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوا جس میں دِلّی کی چند قابلِ ذکر شخصیتوں کا دِل چسپ انداز میں اس طور پر ذکر کیا گیا تھا کہ گزرے ہوئے دِنوں کی یادوں بھری تصویریں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اُس مضمون کو نہ صرف مَیں نے بلکہ سب شمارہ پڑھنے والوں نے پسند کیا اور شاہد صاحب کو دِل کھول کر داد دی۔ ۱۹۵۴ء میں شاہد احمد دہلوی نے اُس

darulkutub.blogspot.com

مضمون کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک طویل مضمون "دِلّی کی چند اَدبی شخصیتیں" کے نام سے لکھا، جو "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر (جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہُوا۔ اس مضمون میں ان شخصیتوں کے کردار، عادات و خصائل، اطوار اور رنگ ڈھنگ کو اپنے مخصوص لہجے، زبان اور انداز میں اس طور پر بیان کیا کہ ان کرداروں کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے شعور کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ "خریطۂ خیال" میں تاثرات غالب تھے۔ اس مضمون میں خاکہ نگاری کا رنگ گہرا تھا۔ تین سال بعد ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور کے ۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شاہد صاحب نے ایک اور مضمون "وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں" کے عنوان سے لکھا۔ اس مضمون میں ان کے اندازِ بیان میں اور رچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ زبان میں حسن اور بیان میں رنگینی بڑھ گئی تھی۔ کرداروں کے نقوش اُجاگر ہو کر نکھر گئے تھے۔ یہ مضمون اتنا پسند کیا گیا کہ ہر طرف سے ایسے مضامین لکھنے کی فرمائشیں آنے لگیں۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ میں اور شاہد بھائی ہر بات، ہر مشورے میں ایک دُوسرے کے شریک تھے اور جہاں جاتے، ساتھ جاتے تھے۔ اُسی زمانے میں میں نے شاہد بھائی سے کہا کہ یہ چھوٹے چھوٹے خاکے ہیں۔ اگر ان شخصیتوں کے پُورے خدوخال اُجاگر کیے جائیں اور ہر ایک کے بارے میں الگ الگ مضمون یا خاکے لکھے جائیں تو یہ بڑا کام ہوگا۔ فہرست بنائی گئی جو بہت طویل تھی۔ پھر یہ طے ہُوا کہ جن شخصیتوں کا ذکر ان مضامین میں آیا ہے پہلے اُن پہ پُورا مضمون (خاکہ) لکھا جائے۔ اسی عرصے میں شاہد صاحب نے خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی، عنایت اللہ دہلوی، اُستاد بیخود دہلوی، مرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ پر خاکے لکھے اور ان خاکوں کو دوبارہ لکھا جو وہ پہلے لکھ چکے تھے اور جن میں منٹو، میراجی وغیرہ کے خاکے شامل تھے۔ یہ سب خاکے ۱۹۶۲ء میں مکتبۂ نیا دَور سے "گنجینۂ گوہر" کے نام سے شائع ہوئے۔ تخلیقی اعتبار سے یہ شاہد احمد دہلوی کا بہترین دَور تھا۔ انھیں راستہ مل گیا تھا اور وہ مسلسل دِلّی کے موضوع پہ مضمون لکھ رہے تھے۔ زبان اُن کے گھر کی لونڈی تھی اور بیان کا زور انھیں ورثے میں ملا تھا۔ اس عرصے میں انھوں نے متعدد مضامین لکھے جو بعد میں "اُجڑا دیار" کے نام سے کتابی شکل میں مکتبۂ دانیال سے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ بیمار ہو گئے اور ۲۷ مئی

۱۹۶۷ء کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک جن شخصیتوں کے خاکے انھوں نے لکھے تھے وہ تو "گنجینۂ گوہر" میں شائع ہو گئے لیکن کچھ خاکے جو ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان لکھے گئے، وہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکے تھے اور مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے تھے۔

شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد میں نے "ساقی" کا "شاہد احمد دہلوی نمبر" مرتّب کیا۔ تو ارادہ تھا کہ باقی خاکے بھی مرتّب کر کے شائع کرا دُوں گا۔ ۱۹۶۲ء سے میں "تاریخ ادبِ اُردو" لکھنے میں خود اتنا مصرُوف ہُوا کہ کوئی اور کام کرنے کی نوبت ہی نہ آئی، لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کو جلد شائع ہونا چاہیے۔ پچھلے سال مجھے ذرا سی فرصت ملی تو میں نے وہ تمام رسالے نکالے جن میں یہ خاکے شائع ہوئے تھے۔ ان خاکوں کو جمع کیا: انھیں پڑھا اور تصحیح کی۔ جن کے اصل مسوّدے میرے پاس تھے ان سے مقابلہ کیا اور یہ کتاب کم و بیش مرتّب کر دی۔ ابھی یہ کام یُوں ہی پڑا رہتا اگر برادرم مُشفق خواجہ صاحب اس مجمُوعے کو جلد شائع کرنے کا تقاضا نہ کرتے۔ میں نے لگ کر اس کام کو پُورا کیا اور اسے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی۔ وہ شخصیتیں جن کے بارے میں شاہد احمد دہلوی نے و ... ان کے سب واقعات کو، اس شخصیت کے تحت، ایک جگہ کر دیا ہے۔ جن شخصیتوں پر انھوں نے اختصار سے لکھا لیکن بعد میں ان پر تفصیل سے پُورا مضمون لکھا، اس کتاب میں یہ پُورا مضمون لے لیا ہے اور مختصر مضمون کو اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ پُورے مضمون میں سب باتیں آ گئی ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں ۱۳ پورے خاکے اور ۱۳ مختصر خاکے یعنی کُل ۲۶ خاکے شامل ہیں۔ یہ سب خاکے جہاں زبان و بیان اور شخصیت کے انوکھے پن کی وجہ سے غیر معمُولی اہمیت رکھتے ہیں، وہاں یہ سب پہلی بار کتابی صورت میں مرتّب و یک جا ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے جہاں "ساقی" کے ذریعے کم از کم تین نسلوں کی آبیاری کی، وہاں یہ خاکے اُردو زبان و ادب کے وہ رنگین اور خوشبودار پھُول ہیں جو ہمیشہ تازہ رہیں گے۔

کتاب کی ترتیب میں میں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ایک مضمون شاہد احمد دہلوی کے

qasarulkutub.blogspot.com

بارے میں اور ایک مضمون اُن کے اسلوبِ بیان کے بارے میں لکھ کر شامل کیا ہے، اور آخر میں شاہد صاحب کی مطبوعہ تصانیف و تراجم کا اشاریہ اور اُن کی زندگی کے مختصر حالات و کوائف بھی شامل کر دیے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کے مطالعے سے جہاں شاہد احمد دہلوی کی سدابہار تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں، وہاں اُن کی شخصیت اور ان کی ذات کے بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

شاہد احمد دہلوی، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنّت دے، صحیح معنی میں ایک بڑے آدمی تھے۔ ایک تاریخ ساز مدیر تھے۔ ایک صاحبِ طرز ادیب تھے، جن کی یادیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اب نہ شاہد صاحب ہیں اور نہ "ساقی" ہے لیکن اُن کی تحریریں آج بھی ہمارے ذوقِ ادب کو سیراب کر رہی ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

جمیل جالبی

شاہد احمد دہلوی

جب میں اُس دکان میں داخل ہُوا تو وہاں ایک نئے صاحب کو بیٹھے دیکھا ڈھیلی ڈھالی گہرے کتھئی رنگ کی شیروانی، کھلتا ہُوا سیاہ رنگ، پھیلی ہُوئی کھڑی ناک، مُسکراتے ہُوئے سنجیدہ ہونٹ، مُنھ میں بیڑی، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، ڈاڑھی مُونچھ صاف، سر پر جناح کیپ، چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ کوئی بات کرتا تو مُسکرا کر خاکسارانہ انداز میں مختصر سا جواب دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کوئی کچھ اور کہتا تو زور سے ہنس کر ذرا سی دیر میں پھر سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ کتابوں کی دکان تھی۔ بہت سے خریدار آجا رہے تھے۔ آنے والوں میں سے اکثر اُن صاحب سے سلام دُعا کرتے۔ احترام سے ہاتھ ملاتے۔ خیر صلّا خیر عافیت پُوچھتے۔ کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ میں نے برابر کھڑے ہُوئے ایک صاحب سے پوچھا جو اُن سے بات چیت کر کے ابھی فارغ ہُوئے تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جلدی سے بولے ــــــ "شاہد احمد دہلوی ہیں۔" یہ نام سُنتے ہی میرے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی۔ شاہد صاحب کا نام میں نے سیکڑوں بار سُنا اور پڑھا تھا۔ اور اُن سے ملنے کی تمنّا ایک زمانہ سے تھی۔ چوں کہ دُکان میں بہت لوگ کھڑے تھے، میری ہمّت نہ ہُوئی کہ میں اُن سے ہاتھ ملاؤں۔ کچھ دیر الگ کھڑا اُن کو ایک خاص احترام کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگ مجھے دیکھنے لگے ہیں، میں دکان سے باہر آگیا۔

شاہد صاحب اس زمانہ میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان اور اس میں کئی کُنبے۔ نہ بجلی نہ پانی۔ ابھی بن رہے تھے۔ ایک دن میں ملنے کے ارادے سے چلا۔ بڑی مشکل سے مکان ملا۔ شاہد صاحب ململ کا کُرتا پہنے، تہبند باندھے پلنگ پر

qaisarulkutub.blogspot.com

بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی تیزی کے ساتھ اپنا جال بن رہی تھی۔ میں نے کہا: "شاہد صاحب! میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔" مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ کہا: "آئیے یہیں بیٹھ جائیے۔" اندر سے لیمپ منگوایا جو کراچی کی تیز ہوا کے جھونکے سے فوراً ہی بجھ گیا۔ پھر لالٹین منگوائی جو کچھ دیر تو ٹھیک ٹھیک جلتی رہی، اور پھر ایک دم بھڑکنے لگی۔ اتنے میں کوئی بچّہ اُسے اُٹھا کر اندر لے گیا۔ اسی اندھیرے میں اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ دُنیا زمانے کی باتیں، فساد کے قصّے، دِلّی کا ذکر، اور نہ جانے کیا کیا۔ کہنے لگے "بہت سوں کو تو ابھی معلوم بھی نہیں کہ میں زندہ ہوں۔ کرشن چندر کا خط آیا تھا۔ جس میں میرے انتقالِ پُرملال کے بارے میں تعزیتی جلسہ اور قرارداد کا ذکر کیا تھا، مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ جما جمایا سارا کام بکھر گیا —— دِلّی چھُٹ گئی۔ بہار کالونی میں مکان بنوا رہا ہوں۔" میں کئی گھنٹے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اُن کے اخلاق اور خلوص کو دیکھ کر میرا دل بڑھ گیا اور پھر ہمارے تعلّقات اتنی تیزی کے ساتھ بڑھے کہ وہ میرے دُکھ درد میں اور میں اُن کے دُکھ تکلیف میں ساتھ۔ اُٹھنا بیٹھنا، آنا جانا بڑھ گیا۔ شام کو ہم ساتھ جاتے، چائے پیتے، بے مقصد گھومتے۔ میں نے قدم قدم پر اُن کے خلوص اور محبّت کو محسوس کیا۔ شاہد صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جن کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

کچھ دن بعد شاہد صاحب نے بہار کالونی کا مکان فروخت کر دیا۔ وہاں کی آب و ہوا خراب تھی۔ تمام دیواروں میں شور اور سیل۔ پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا اور وہیں اُٹھ آئے۔ میں نے بھی ایک مکان یہیں خرید لیا تھا۔ جب جی گھبراتا اور کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تو میں ان کے ہاں چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا، گپیں لڑاتا اور چلا آتا۔ جی ہلکا ہو جاتا۔ ساری کوفت دُور ہو جاتی۔ اگر میں ایک آدھ دِن نہ جاتا تو خود آتے اور نہ آنے کی وجہ پوچھتے۔

فسادات کے بعد کون سی مصیبت تھی جو اُن پر نہ ٹوٹی۔ دوست دشمن ہو گئے اپنے بیگانے ہو گئے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر دِلّی کے پُرانے قلعہ میں آ پڑے۔ کئی دن وہاں رہے۔ مصیبتیں جو سب نے جھیلیں، ان سے زیادہ انھوں نے جھیلیں —— زندگی بھر

آرام سے گزری تھی۔ مصیبت یا پریشانی کا ہے کو دیکھی تھی۔ یہاں کئی دن دھوپ، بارش، بدبُو، اور تعفّن میں چھوٹے بڑے بچّوں کے ساتھ پڑے رہے۔ اور پھر ایک دن مہاجرین کی ٹرین میں بیٹھ کر راستے کی صعوبتیں اور حملے برداشت کرتے لاہور آ گئے۔ اور جب لاہور میں کچھ نہ ہوا تو کراچی آ پڑے۔ اور اپنا پُرانا مشغلہ پھر سے شروع کر دیا اور وہ پونجی، جو ساتھ لا سکے تھے، اسی پر گنوا دی۔ دِلّی کی ساری جائیداد اور کتب خانہ کچھ کسٹوڈین صاحب کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا، اور کچھ خورد بُرد ہو گیا۔ "ساقی" آج تک کبھی فائدہ میں نہیں چلا تھا۔ کراچی میں تو کیا چلتا۔ لوگوں کو گھربار اور دال روٹی کی پڑی تھی، کتابیں اور رسالے کون پڑھتا۔ تہذیب اور کلچر کی باتیں کون سُنتا۔ شاہد صاحب کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ صدمہ پر صدمہ، بڑا کنبہ، کھانے والے سب اور کمانے والا کوئی نہیں۔ شاہد صاحب اگر ساقی نہ نکالتے اور گانے بجانے کا شوق نہ ہوتا تو شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکتے۔ کچھ ساقی میں مصروف رہے، اور کچھ گانے بجانے میں۔ بُرے دِن گزر گئے۔ بات پُرانی ہو گئی، غم ہلکا ہو گیا۔

اس عرصے میں سب کچھ ہوا لیکن شاہد صاحب کی وضع داری میں فرق نہیں آیا۔ اس مصیبت کے زمانے میں نہ انھوں نے کسی کی خوشامد کی، نہ کسی سے گِر کر بات کی، نہ کہیں خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ بے وطنی اور غربت میں انسان کے جوہر کھُلتے ہیں۔ کمینے اور شریف کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی خو چھوڑی نہ وضع بدلی۔ نہ تنک مہر بن کر کسی سے سرگرانی کی وجہ پوچھی اور یہ بات اُن کے کردار کا وہ جوہر ہے جو گنتی کے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات اُن کی سادگی ہے۔ جھوٹی عزّت اُن کو پاس سے چھو کر نہیں گزری۔ تہبند باندھے چلے آ رہے ہیں، کھُل کر باتیں کر رہے ہیں۔ نہ کسی کی بُرائی، نہ کسی کی غیبت۔ سب پر فقرے چُست کریں گے، سب کا ذکر کریں گے۔ مزا لیں گے۔ مذاق اڑائیں گے جس قسم کی صحبت میں بیٹھیں گے، اُس میں گھُل مِل جائیں گے۔ محفلوں میں بُڈھے، جوانوں میں جوان اور بڑوں میں بڑے۔ ہر ایک کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہر ادیب کا ذکر کریں گے۔ اپنی مُلاقات کی تفصیل سُنائیں گے۔ لچّھے دار انداز میں گفتگو کریں گے۔ خود بھی

ہنسیں گے اور سننے والوں کو بھی ہنسائیں گے۔ گھنٹوں چہل رہے گی۔ اچھی بُری ہر قسم کی بات کریں گے۔ شاہد صاحب سے باتیں کرتے وقت آدمی سب کچھ بھول کر ایک الگ دُنیا میں کھو جاتا ہے۔ جہاں خلوص، ہنسی، دلچسپی، ادب اور موسیقی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ادیبوں اور شاعروں کے قصّے ہوں گے، اُن کے بھی جو مر گئے، اُن کے بھی جو جیتے ہیں اور اُن کے بھی جو ابھی اُبھر رہے ہیں۔ ادیبوں کا ذکر آئے گا۔ ان کی اچھی بُری عادتوں کا ذکر کریں گے۔ چال چلن، اطوار اور حماقتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ کُھل کر ان کے لین دین، مروّت، معاملہ، شراب، عورت، شادی بیاہ، عشق اور ہوس کا ذکر کریں گے۔ ایک دن مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ دِلّی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجاز بھی تھے۔ مجاز شراب کا رسیا، عورت کا عاشق۔ بات چل نکلی۔ مجاز نے شراب پی پی کر اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ شاہد صاحب نے کہا: "مجاز مر جاؤ گے۔" مجاز نے بے ساختہ کہا۔ شاہد صاحب سے

موت بھی اس لیے گوارا ہے
موت "آتا" نہیں ہے "آتی" ہے

کہنے لگے حیدرآباد میں جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش شراب پی رہے تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ دَور چل رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "شاہد صاحب! آپ بھی پیجیے۔" میں نے انکار کیا۔ ان کا اصرار بڑھا۔ جب اُدھر سے اصرار اور اِدھر سے انکار بڑھا تو جوش اپنے مخصوص انداز میں بولے ؎

"ساقی" کے "مدیر" اور نہیں ہیں مخمور
برعکس نہند نامِ زنگی کافور

ہر ایک سے ملتے ہیں اور کھُل کر ملتے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو، لیکن ملیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے نئے واقف کار نہیں، پُرانے دوست ہیں۔ ایسے موقع پر ہمدردی کی باتیں کریں گے اور مقدور بھر جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں گے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انھی کی وجہ سے پیٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ادیب بھی ہیں اور ڈوم ڈھاڑی بھی۔ بات کرتے میں چلتی پھرتی گالی بھی دیں گے۔ چھیڑ چھاڑ بھی کریں گے، مگر سنجیدگی طبع موجود رہے گی۔ "ساقی" جب کراچی

سے نکلا تو ساقی کے پُرانے منشی بھی یہیں کام کرنے لگے۔ اُن سے بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے مزے لیتے۔ کام کرتے جاتے، فقرے کستے جاتے۔ ایک دن شاہد صاحب، منشی جی اور میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ منشی جی اپنی بیوی سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ بُڈھے آدمی ہیں لیکن اُس کے بُرے سلوک کے ایسے شاکی کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ شاہد صاحب بہت دیر تو سنتے رہے۔ پھر ایک دم بولے: "کیوں بھئی! تمھاری "سوتیلی بیوی" ہیں؟" اور پھر ہنسنے لگے۔

مارٹن روڈ پر سرکاری کوارٹر ہیں جو سب کے سب ہم شکل اور یکساں ہیں۔ ایک دن شام کو گھر لوٹ رہے تھے۔ غلطی سے کسی اور مکان میں گھُس گئے۔ بلاتکلّف اندر کمرے میں آ گئے۔ شیروانی اتاری اور کھونٹی پر لٹکانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کھونٹی وہاں نہ تھی، کسی کو آواز دی۔ ایک عورت کمرے میں آئی۔ غیر مرد کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ جلدی سے شیروانی لیے اور دونوں ہاتھوں سے دستار تھامتے باہر نکلے۔ اندر سے عورتیں چیخنے اور چلّانے لگیں۔ انھوں نے معذرت چاہی۔ کہنے لگے۔ "جمیل صاحب! قربِ قیامت ہے۔ ہر چیز ہم شکل ہونے لگی ہے۔" اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔ شاہد صاحب ہنستے بڑے مزے سے ہیں۔ پہلے بات کہیں گے مزے لے لے کر، تفصیل کے ساتھ۔ بات کے دوران میں وہ بالکل سنجیدہ رہیں گے۔ سُننے والا مُسکراتا رہے گا جب بات ختم ہو جائے گی تو پھر گہری گہری آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اور یک لخت زور زور سے ہنسنے لگیں گے۔ پھر ہنسی کا غوطہ لگائیں گے اور پھر ہموار ہو جائیں گے۔ اُن کے ہنسنے کا انداز دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گھنگھور گھٹا میں ابابیل سیدھی اُڑتے اُڑتے بھیگی بھیگی فضا میں غوطہ لگاتی ہے اور پھر سیدھی اُڑنے لگتی ہے —— پھر غوطہ لگاتی ہے اور سیدھی اُڑنے لگتی ہے۔

شاہد صاحب کو شاعروں سے چِڑ ہے۔ چِڑ اِن معنی میں نہیں کہ وہ شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان معنی میں کہ شاعروں کو سُنانے کا مرض ہوتا ہے اور انھیں سُننے سے اللہ واسطے کا بَیر ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑے کھرے ہیں۔ صاف صاف لحاظ

qasrulkutub.blogspot.com

مروّت کو بلائے طاق رکھ کر سختی سے انکار کر دیں گے۔ کہنے لگے: "جمیل صاحب، اگر میں ایسا نہ کروں تو میری زندگی عذاب بن جائے۔ مجھے سڑک پر، ہوٹل میں، بسوں میں، گھروں پر، دعوتوں میں، ہر جگہ غزلیں سنانے لگیں" —— دو تین سال پہلے کی بات ہے، ایک صاحب لکھنؤ سے آئے۔ طبلہ بجاتے تھے۔ موسیقی کے سلسلے میں شاہد صاحب کی تعریف سُنی تھی۔ شاہد صاحب سے ملنے آئے۔ "کُند ہم جنس با ہم جنس پرواز" کے مصداق پھر روز آنے لگے۔ اپنے طبلے کی بہت ڈینگیں مارتے۔ کئی محفلوں میں انھوں نے طبلہ بجایا۔ شاہد صاحب نے تعریف کی۔ کچھ مروّت سے، کچھ ویسے بھی، اناڑی تھے۔ ایک دن گانے بجانے کی ایک محفل میں مصر ہوئے کہ شاہد صاحب ان کے ساتھ گائیے۔ شاہد صاحب راضی ہو گئے —— لیکن طبلہ بجاتے وقت وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ کسی صورت میں گانے والے پر غالب آ جائیں اور شاہد صاحب کو "من چہ می سرایم" کا احساس ہو جائے —— شاہد صاحب نے جب یہ دیکھا تو ایسے اُستادانہ انداز سے راگ گایا کہ کچھ دیر بعد طبلہ صاحب عاجز ہو گئے۔ شاہد صاحب نے کہا۔ "میر صاحب! کیا بجا رہے ہیں؟" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور اُن کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔

یہی صاحب ایک دن تشریف لائے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ سالنامے کی تیاری تھی۔ کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں۔ وہ فرمانے لگے۔ "شاہد صاحب میں نے ایک غزل کہی ہے، ذرا سن لیجیے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی —— شاہد صاحب نے انھیں دیکھا۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ کہنے لگے: "صاحب، مروّت میں ایک دفعہ بُرا کام کرایا جا سکتا ہے مگر غزل نہیں سُنی جا سکتی۔ ایک دفعہ میں غزل سُن چکا ہوں۔ اب بار بار تو یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔" وہ بے چارے دم بخود رہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ مگر شاہد صاحب کا پیچھا اس پر بھی اُن سے آج تک نہیں چھوٹا۔

ایک دن ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط میری طرف بڑھایا۔ بولے۔ "پڑھ لیجیے۔" اُس میں لکھا تھا۔ "مکرمی، غزل روانہ ہے۔ بڑی محنت اور کاوش سے کہی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بہت پسند کی ہے۔ براہِ کرم "ساقی" میں نمایاں طور پر شائع فرما کر ممنون فرمائیے۔"

خط پڑھ کر میں نے واپس کر دیا۔ کہنے لگے: "جمیل صاحب، کیا سالے کو ٹائیٹل پیج پر چھاپ دوں؟"

ایک دن باتوں باتوں میں سرکاری افسروں کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے: "یہ سالے ہر وقت اور ہر جگہ افسر ہی رہتے ہیں۔ انسان کبھی نہیں ہوتے۔ ایسے ایسے لائق افسر پڑے ہیں کہ جو جس کام پر لگا دیا گیا ہے بس وہی کام اُسے نہیں آتا۔" ایک محکمے کے ایک بڑے افسر کا ذکر کرنے لگے۔ وہ طباعت کے نگراں تھے۔ ایک صاحب اُن کے پاس گئے۔ اُن کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بڑے مسخرے اور ہنس مُکھ۔ اُن سے کہنے لگے —— صاحب، آپ کی سرکاری طباعت میں لفظوں میں ذرا بھی چمک نہیں ہوتی۔ شاید آپ کتابت کے بعد مسطر پر زیتون کا تیل نہیں پھرواتے؟" یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہی گئی تھی۔ انھوں نے فرمایا —— "نہیں تو" —— "یہی وجہ ہے کہ الفاظ چکنے نہیں ہوتے۔" یہ تو کاتب کا کام ہے کہ وہ کتابت کے بعد مسطر پر تیل کا پچارا پھیرے۔" وہ غصّے میں بھر گئے۔ فوراً انچارج کاتب کو بلایا، ڈانٹا اور کہا۔ "عجیب بات ہے کہ آپ اپنے تجربہ کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، لیکن زیتون کا تیل تک مسطر پر کتابت کے بعد نہیں پھیرتے۔" کاتب یہ سُن کر سنّاٹے میں آ گیا۔ کہنے لگا: "صاحب!" —— "صاحب واب کچھ نہیں، آئندہ سے خیال رہے۔" کاتب چلا گیا۔ وہ صاحب ہنسنے لگے۔ "یار، میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

شاہد صاحب چائے کے بہت دھنی ہیں۔ دن میں بیسیوں پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اس میں اچھی بُری کی کوئی تخصیص نہیں۔ چائے ہو اور بس۔ مہینے میں پندرہ سو بیڑیاں پی جاتے ہیں۔ ساقی کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ایک دن حسبِ معمول بنیان پہنے، تہمند باندھے زمین پر بیٹھے پرچہ ٹیک کر رہے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔ "شاہد صاحب، ایسے میں آپ کی تصویر لے لی جائے۔" زور سے ہنسے اور کہنے لگے۔ "ہاں اس کے نیچے لکھ دینا —— "پچیس سال ادب کی خدمت کرنے کا ثمرہ"

گانے کے رسیا ہیں اور فن کے اُستاد۔ ہندوستان و پاکستان میں ایک آدھ ہی شخص

qasarulkutub.blogspot.com

ایسا ہوگا جو اس فن سے ایسا واقف ہو جیسے کہ شاہد صاحب ہیں۔ مَیں نے بڑے بڑے خاندانی خاں صاحبوں کو ان کے سامنے عقیدت مندانہ طریقے سے بیٹھے دیکھا ہے۔ اُستاد بُندو خاں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ سارنگی بجانے سے پہلے کم از کم تیس چالیس منٹ تک بھری محفل میں سارنگی کے تاروں کو چلاتے رہتے ہیں۔ سامعین بیٹھے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہر محفل میں ان کی یہ روش قائم رہتی ہے۔ کس کی مجال کہ کوئی ان سے کچھ کہے۔ اپنے فن کے لاثانی فن کار۔ ناراض ہو جائیں یا رُوٹھ جائیں تو پھر منائے نہ منیں۔ لیکن مَیں نے دیکھا ہے کہ جب شاہد صاحب ان کو غصّے بھرے لہجے میں ڈانٹ دیتے ہیں یا پھر جل کر اس طرح کی کسی اور بات کو ٹوک دیتے ہیں، تو وہ اُن کی بات ایسے سُن لیتے ہیں جیسے کوئی ان کے اُستاد یا بزرگ ہوں۔ وہ ان فن پر بھی ماہرانہ انداز سے بیٹھتے ہیں اور ساتھ ساتھ گا بھی اُستادانہ طریقے پر لیتے ہیں۔ مَیں نے انھیں بیسیوں دفعہ سُنا۔ ریڈیو پر بھی اور محفلوں میں بھی گانے والے کے جوہر محفل میں کھلتے ہیں۔ شاہد صاحب جب محفل میں گاتے ہیں تو وہ لوگ بھی جو کلاسیکل موسیقی سے ناواقف ہیں، تال اور سُروں کے زیر و بم اور اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک دن میرے ہاں محفل تھی۔ کراچی کے سب مشہور گویّے اور سازندے جمع تھے۔ رات کے تین بجے تھے۔ شاہد صاحب کی باری آئی۔ سب نے آنکھیں مَلیں، پہلو بدلے اور انھیں سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شاہد صاحب سامنے آئے۔ طبلچی نے طبلہ کھڑکھڑایا۔ سارنگیہ نے سارنگی کے تار کسے۔ ستاریہ نے ستار کی کھونٹیاں گھمائیں۔ ایک شاگرد نے تانپورہ سنبھالا۔ شاہد صاحب نے گانا شروع کیا۔ تقریباً پون گھنٹہ گائے۔ ایسا سماں باندھا کہ سب محو ہو گئے۔ محفل کو سانپ سا سُونگھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی جادوگر نے ساری محفل کو باندھ دیا ہے۔ ڈھلتی رات، چاروں طرف فضا میں سنّاٹا، وقت کی راگنی، مال کوس گا رہے تھے۔ ترانہ میں "تنانا دیم" کی تکرار پہ ستاریہ اور سارنگیہ ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ گویّا تاروں کی موسیقی سے بہت آگے نکل گیا۔ طبلچی بے قابو ہو کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں رَس گھُل رہا ہے۔

گاتے اُونچی آواز میں ہیں۔ بول بہت یاد ہیں۔ بیسیوں شاگرد ہیں۔ سب اُستاد کہتے ہیں۔ طبلہ، سارنگی اور دوسرے ساز کمرے میں رکھے رہتے ہیں۔ ڈوم ڈھاڑی، اتائی اور

خاں صاحب سب اُن کے فن کا لوہا مانتے ہیں۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ فنِ موسیقی کو ہندوؤں نے اپنا لیا۔ حالاں کہ جتنی خدمات، ایجادیں اور اضافے مُسلم فن کاروں نے کیے، دُوسری قوم اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچی۔ اس سلسلے میں اُن کے متعدّد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی شرافت ضرب المثل ہے۔ پچیس تیس سال ہو گئے ہیں لیکن آج تک کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے اور نہ آج تک کسی طوائف کو شاگرد بنایا۔ اور وہ صرف اس لیے کہ اسی چیز نے اس عظیم فن کو بدنام کر دیا ہے اور شرفا اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کا ایک شاگرد ایک مرتبہ کسی طوائف کے ہاں چلا گیا۔ کچھ آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ابھی مبتدی تھا۔ شاہد صاحب کو معلوم ہوا تو بہت بگڑے۔ کہنے لگے: "اللہ تعالیٰ نے موسیقی و شراب کو اِسی لیے حرام کیا ہے کہ اس میں بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عام آدمی کے پاس نہیں ہوتا۔ اسے ہی دیکھو (اپنے شاگرد کی طرف اشارہ کر کے) کچھ آتا جاتا نہیں ہے اور سبق دینے لگے ہیں۔" کراچی میں مُسلمان، ہندو اور پارسی لڑکیاں اسی محفل میں شریک ہوتی ہیں، جس میں شاہد صاحب شریک ہوں۔ موسیقی کی وہی محفلیں کامیاب ہوتی ہیں جن کے محرک شاہد صاحب ہوں۔ اور اسی وجہ سے پاکستان میوزک اکاڈمی کے جلسے اور محفلیں کراچی میں سب سے زیادہ شاندار اور کامیاب ہوتی ہیں۔ شاہد صاحب اس اکاڈمی کے بانی اور صدر ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ خاص طور پر اپنے بیوی بچّوں کو ضرور لے جاتے ہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ شاہد صاحب ابھی پڑھتے تھے۔ دِلّی میں کوئی گانے کی محفل تھی۔ دِلّی کے مشہور گویّے چاند خاں کے چھوٹے بھائی رمضان خاں بھی اس میں شریک تھے۔ بڑے اور خاندانی گویّوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شاہد صاحب کی جب باری آئی تو وہ گانے کے لیے سامنے آئے اور "خیال" گانا چاہا۔ رمضان خاں اس پر اَڑ گئے۔ کہنے لگے: "خیال" نہیں گا سکتے۔ میاں صاحب زادے غزل گاؤ۔" ان کے خیال میں اُستادوں کی محفل میں تو مشّاق اور غیر خاندانی گویّے کا "خیال" گانا ان کی ہتک اور بے عزتی تھا۔ شاہد صاحب بے چارے اُٹھ آئے۔ ذلّت کا ایک احساس ان کے سارے وجود پر چھا گیا۔ انھوں نے اس فن کو انتہائی محنت اور کاوش سے حاصل کرنا شروع کیا۔ دن رات کا ریاض، بڑے بڑے گویّوں کی

qasarulkutub.blogspot.com

صُحبت ، اچھے اُستادوں کی شاگردی ۔ چھُپے ہوئے جوہر نکھر آئے اور ایسے چمکے کہ خود استادوں کی صف میں شامل ہوگئے ۔ اور اب پچیس تیس سال بعد عید کے چاند ان کے بڑے لڑکے کی شادی تھی ۔ ولیمہ کی دعوت کے بعد رات کو گانا بجانا تھا ۔ استاد بندو خاں ، رمضان خاں ، امراؤ خاں ، ظہوری ، کبیر خاں اور دوسرے نامی فن کار جمع تھے کہ ایک نوجوان لڑکا گانے کے لیے آیا اور "خیال" گانا شروع کیا ۔ شاہد صاحب ، جو ایک طرف کھڑے تھے ، بولے : "میاں صاحب زادے ، خیال مت گاؤ ، غزل گاؤ ۔" اور اس پر اتنا اصرار بڑھا کہ وہ خیال نہ گا سکا ۔ میں نے شاہد صاحب کے چہرے کو دیکھا ۔ پھر رمضان خان کی طرف دیکھا اور میرا ذہن ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا ۔

شاہد صاحب دِلّی کی ذاتی ہیں ۔ دِلّی کی ہر بات ، ہر رسم و رواج ، ہر عمارت ، ہر پہلو ، ہر شخص سے خوب واقف ہیں ۔ دِلّی کا کبابی ہو یا باورچی ، کبوتر باز ہو یا قلفی علیم والا ، سب کے متعلق پوری معلومات رکھتے ہیں ۔ جو زندہ ہیں ان سے دُعا سلام ہے ۔ اکثر کہتے ہیں "جمیل صاحب ، چلو بھئی دِلّی کے کباب کھالیں ۔ فلاں کبابی کا لڑکا آگیا ہے ۔ دِلّی میں یہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا ۔ اب تو گدّی پر بیٹھتا ہے ۔ لیکن اس زمانے میں پنکھا جھلتا تھا ۔ دِلّی سے شاہد صاحب کو والہانہ محبّت ہے ۔ بی ، اے کرنے کے بعد داخلہ کے لیے علی گڑھ گئے ۔ ابھی غازی آباد ہی پہنچے تھے کہ دِلّی کی یاد ستانے لگی ۔ علی گڑھ پہنچے ، پروفیسر ہادی سے ملے اور دُوسرے دن دِلّی واپس آگئے اور پھر واپس نہ گئے ۔ کراچی آکر دِلّی کے بارے میں شاہد صاحب نے بہت سے مضامین لکھے ۔ یہ مضمون دِلّی سے متعلّق اچھوتے اور مخصوص اسلوب میں ایسی تہذیبی دستاویز ہیں جن کا لکھنا صِرف شاہد صاحب ہی کا حِصّہ ہے ۔ اُن کے پاس معلومات بھی ہیں اور کوثر و تسنیم میں دُھلی ہُوئی دِلّی کی پیاری اور ٹکسالی زبان بھی ۔ ان سب مضامین کو یک جا کر دیا جائے تو خاصے کی چیز بن جائے ۔ یہ سب مضامین دِل چسپ ، ایسے لطیف اور ایسے پیارے ہیں کہ افسانے کی طرح پڑھے جاتے ہیں ۔ دِلّی کی بپتا ، چوک کی بہار ، دِلّی کی عید ، سترھویں کی سیر شائع ہو کر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ——— ایسے ہی اُن کے ترجمے ہیں ۔ وہ اُردو کے ایک بہترین مترجم ہیں ۔ انھوں

نے سیکڑوں مشہور افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے کیے ۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمے نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتے ہیں ۔ ترجمہ کرنے کی مشق اتنی بڑھی ہُوئی ہے کہ بڑی تیزی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں ۔ مسودہ میں کہیں کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی ۔ جو مسوّدہ ہوتا ہے وہی مبیضہ ۔ یہ خوبی مجھے بہت کم مترجموں میں نظر آتی ہے ۔

ایک دن ترجمہ کر رہے تھے ، میں پہنچ گیا ۔ دیکھ کر مُسکرائے ۔ کہنے لگے ۔ "مزدُوری کر رہا ہُوں ۔" ریڈیو بج رہا تھا ۔ پکّا گانا ہو رہا تھا ۔ جب تال سُر کا اتار چڑھاؤ ہوتا تو اُن کی آنکھ اور سر بھی اسی اتار چڑھاؤ پر چلتے ۔ میں نے کہا ۔ "شاہد صاحب ، موسیقی کے پس منظر میں ترجمہ ہو رہا ہے ۔" کہنے لگے ۔ "نہیں بھئی پلمن ازم کی مشق کر رہا ہوں ۔ ایک وقت میں دو کام ۔"

ہنسی مذاق ان کی فطرت میں شامل ہے ۔ میاں بیوی میں بڑے خوش گوار تعلقات ہیں ۔ سب کی موجودگی میں بھابی کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں ۔ اُن کی ہمّت شِکنی کرتے رہتے تھے ۔ پانچ بچّوں کی ماں ۔ کوئی بیس سال کے بعد انھیں شوق ہُوا کہ وہ بی ، اے کا امتحان دیں ۔ تیاری شروع کر دی ۔ امتحان قریب تھا ۔ میں پہنچ گیا ۔ وہ مجھ سے انگریزی شاعروں کے متعلق کچھ پوچھنے لگیں ۔ شاہد صاحب بولے ۔ "جمیل صاحب ! اگر یہ پاس ہوگئیں اور انھیں بی ، اے کی سند مِل گئی تو میں اپنی سند واپس کر دُوں گا ۔"

پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسندوں نے واویلا مچایا اور اپنے سے جُدا نظریہ رکھنے والوں کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دیا تو لاہور کے جلسے میں "ساقی" کے خلاف بھی قرارداد منظور ہُوئی ۔ "ساقی" اور "ادارۂ ساقی" کو رجعت پسند قرار دیا ۔ "ساقی" کو رجعت پسند قرار دینے اور بائیکاٹ کرنے میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھیں ساقی اور شاہد صاحب کے توسّط یا توسّل سے شہرت ملی تھی یا ان کی ادبی حیثیت قائم ہُوئی ——— بات کچھ بھی نہ تھی عسکری صاحب بے چارے "جھلکیاں" لکھتے تھے ۔ اس میں کھری کھری باتیں کرتے تھے ۔ وہ باتیں جو اُن کے دماغ میں آتی تھیں ، واضح طور پر ایمان داری کے ساتھ لکھ دیتے تھے ۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ انتشار اور ابر آلود فضا کو چیر کر صاف اور واضح فکر تک پہنچ سکیں ۔

qasarulkutub.blogspot.com

اس تحریک میں ترقی پسندوں کے محدود نظریات بھی آ گئے۔ ادب میں سطحی سیاست، غلط پالیسی، اور پروپیگنڈا کا ذکر بھی آیا۔ ترقی پسندوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ "ساقی" مطعون ہوا۔ سب نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ترقی پسند کس حد تک آمرانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اور وہ کیا چاہتے ہیں اور کس انداز سے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ترقی پسندوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے قرارداد پاس کرنے یا کسی رسالہ کا بائیکاٹ کرنے سے رسالہ اشاعت و مقبولیت کے اعتبار سے کس حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔ شاہد صاحب کہا کرتے تھے کہ ابھی کچھ دن کی بات ہے، سب ڈھنگ پر آ جائیں گے۔ میں تو جب بھی ان کو چھاپنے کو تیار تھا اور اب بھی ہوں۔ "ساقی" کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور مختلف الخیال قسم کے مضامین اور نظریات پیش کر سکے تاکہ اس توازن سے ادب صحیح معنی میں ترقی کر سکے۔ مثال کے طور پر انھوں نے ایسے مضامین شائع کیے جو خود ادارے کے ایک آدمی ——— عسکری صاحب کے خلاف تھے۔ نہ اس پر ان کو اعتراض تھا نہ خود عسکری صاحب کو۔ انتظار حسین نے عسکری کے خلاف مضمون لکھا۔ وہ "ساقی" میں چھپا اور پسند کیا گیا۔ میں نے خود بارہا عسکری کی مخالفت "باتوں" میں کی۔ ادب ONE WAY TRAFFIC تو ہے نہیں کہ جو ایک گروہ یا جماعت پیش کرے۔ وہی صحیح ہو اور جو راستہ اس نے خیالات کی آمد و رفت کا مقرر کر دیا، اس کے علاوہ دوسرا راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاہد صاحب کا کہنا تھا کہ ادیب کو کبھی بھی سیاسی یا جماعتی ہرکارہ نہیں بننا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترقی پسندوں کے ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو انھوں نے کراچی میں جلسہ کیا اور اس میں کھلے بندوں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور وہی راستہ اختیار کیا جس کا پرچار "ساقی" ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ ساقی کی یہ پالیسی دوسروں کو کھٹکتی ہو تو کھٹکا کرے۔ لیکن اس سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا رہا ہے اور ساقی کی اشاعت کا یہی مقصد رہا ہے جسے وہ گزشتہ پچیس سال سے حتی الوسع پورا کر رہا ہے۔ جب ترقی پسند تحریک کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور یارانِ حاشیہ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تحریک کیا ہوتی ہے، اور ترقی پسندی کس چڑیا کا نام ہے؟ شاہد صاحب ہی نے سب سے پہلے دلّی میں "انجمن

ترقی پسند مصنفین" قائم کی تھی۔ جس کے وہ ایک زمانہ تک جنرل سیکرٹری رہے۔ ساقی نے ترقی پسند ادب کی خوب اشاعت کی۔ اُن کی کتابیں شائع کیں۔ ان کے حوصلے بڑھائے۔ اُن کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اُسے ان کی جوہر شناسی کہیے یا ادب کی خدمت کا صحیح و صحت مند جذبہ ——— کرشن چندر سے شاہد صاحب کہہ رہے تھے۔ "کرشن ناول لکھو، میں شائع کروں گا۔" کرشن اس وقت دلّی میں تھے۔ انھوں نے کہا۔ "شاہد بھائی! ایک ہزار روپے دے دیجیے۔ کشمیر جا کر لکھوں گا۔" شاہد صاحب نے ایک ہزار روپے دے دیے۔ کرشن چندر کشمیر چلے گئے اور وہاں کی صحت مند آب و ہوا میں ایک ناول لکھ لائے جو بعد میں "شکست" کے نام سے شائع ہوا۔ عصمت نے ساقی ہی میں لکھنا شروع کیا اور یہیں سے عصمت، عصمت بنیں۔ ساقی نے جتنے ادیبوں کو پیدا کیا اور اُبھارا، کسی دوسرے اردو رسالے کو یہ فخر حاصل نہیں ہے۔ اور یہ شاہد صاحب اور "ساقی" کی وہ خدمت ہے جسے اردو ادب کی تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

وہ واحد شخص ہیں جو نئے اور پرانوں، سب کو جانتے ہیں۔ دلّی میں ایک دکان تھی —— "کتب خانہ علم و ادب" —— یہ ہمیشہ ادیبوں کی بیٹھک اور نشست گاہ رہی ہے۔ وصی اشرف اس کے مالک تھے۔ شام کو یہاں ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔ شعر و شاعری ہوتی۔ تبادلۂ خیالات ہوتا، اچھی بری باتیں ہوتیں۔ جو باہر سے دلّی آتا وہ یہاں آ جاتا اور سب سے مل لیتا۔ سامنے چوک تھا۔ شام ہوئی اور میلہ لگ گیا۔ یہ جگہ دلّی کے عوامی کلچر کا مرکز تھی۔ کبوتر باز، مرغ باز، کبابی، قلفی والے، حلیم والے، کباڑی، کپڑے والے، دہی بڑے اور پھلکی والے اور پنواڑی —— کوئی چیز ایسی ہو گی جس کا سودا یہاں نہ ہوتا ہو۔ سامنے اردو بازار تھا اور یہیں یہ کتب خانہ۔ ایک دن وصی اشرف نے کہا: "شاہد صاحب، اگر آپ ان لوگوں پر لکھ دیں جو کتب خانے میں آئے اور بیٹھے تو بڑی مزے دار چیز بن سکتی ہے۔" شاہد صاحب نے کہا۔ "آپ فہرست بنا دیجیے، جو رہ جائیں گے میں شامل کر لوں گا۔" فہرست جو بنی تو تین سو سے زیادہ افراد تھے ——— شاہد صاحب کے علاوہ ان ادیبوں پر دوسرا کھل کر نہیں لکھ سکتا۔ میں بھی چار سال سے سر ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ژاں پال سارتر نے بھی ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا ہے جس میں اُن تمام ادیبوں، فنکاروں، شاعروں کا ذکر کیا

qasarulkutub.blogspot.com

ہے جن سے اکثر ان کی ملاقات ہوتی۔ ضمنی طور پر ادبی تحریکات، میلانات اور نظریات پر بھی بحث ہوتی رہی ہے۔ میرے زیادہ اصرار پر انھوں نے کچھ لکھا جو "خریطۂ خیال" کے عنوان سے "ساقی" میں اور کچھ مختلف عنوانات سے "نقش" اور "ماہِ نو" وغیرہ میں شائع ہوا۔ اگر وہ اس عنوان سے کچھ لکھیں تو خاصے کی چیز بن جائے۔ اس طرح سے تیس چالیس سال کے زمانہ کا احاطہ ہو سکتا ہے اور اردو ادب کے قدیم و جدید رجحانات پر روشنی بھی پڑ سکتی ہے —— ایک تو ذاتی حالات اور پھر شاہد صاحب کا اسلوب —— واقعی مزا آجائے —— دیکھیے اللہ میاں شاہد صاحب کو کب نیکی دیتا ہے۔

شاہد صاحب بڑے کاہل ہیں۔ یہ چیز ان کے وجود کا ناگزیر جزو بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں آنے جانے سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ پابندیٔ اوقات کا یہ عالم ہے اگر کہیں پانچ بجے جانا ہے تو وہاں سات بجے پہنچیں گے۔ یا پھر اتنی پابندی ہوگی کہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں گے۔ انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے اور یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ طبیعت میں مروّت اور لحاظ حد درجہ ہے۔ کراچی آئے تو مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ قدردانوں نے جب دیکھا تو ریڈیو میں رکھ لیا۔ بڑی قدر کی معقول مشاہرہ دیا۔ زندگی بھر نوکری کی نہیں تھی۔ نوکری کے لیے کچھ اور خوبیاں چاہئیں، وقت کی پابندی —— مکھن لگانے کی غیر معمولی صلاحیت —— آنا جانا —— کھانا پینا —— اٹھنا بیٹھنا —— اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ باتیں ان میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ لوگ جو قدردان تھے شاکی ہوگئے اور نوکری کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ایک دن کہنے لگے —— جمیل صاحب! پاکستان میں ملازمت اور منافقت شاید ہم معنی الفاظ ہیں۔ واقعی نوکری کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ کہہ کر بیڑی سلگائی اور زور زور سے کش لگانے لگے۔

ایک دلچسپ واقعہ اور سنیے جب پاکستان بنا اور یہ لاہور آئے تو لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ایک دن ریڈیو پاکستان لاہور میں بیٹھے حسبِ معمول بیڑی پی رہے تھے۔ لاہور ریڈیو والے ان کی خاطر تواضع سے اپنی عقیدت مندی اور احترام کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمدردی، خلوص اور محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک خاتون کچھ فاصلہ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ آخر یہ صاحب ہیں

کون؟ کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔ یہ سنتے ہی چونک پڑیں۔ غالباً دورانِ خون تیز ہوگیا تھا۔ دماغ پر استعجاب اور عقیدت کا کوندا لپکا۔ وہ پہلو بدلنے لگیں اور بے ساختہ بولیں۔ "اگر یہ بیڑی نہ پیتے ہوتے تو میں ان پر ابھی عاشق ہو جاتی۔" کہنے لگے۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں کیوپڈ صاحب کی ستم ظریفیوں سے بال بال بچ گیا اور بیڑی میرا (ORGAN OF DEFENCE) بن گئی۔"

شاہد صاحب کو عظیم بیگ چغتائی سے اور عظیم بیگ چغتائی کو شاہد صاحب سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے —— "نیرنگِ خیال" کے عروج کا زمانہ تھا۔ اردو داں طبقے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ عظیم بیگ اسی میں لکھتے تھے۔ جب ان کا مشہور افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" شائع ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ انھوں نے بھی جو کبھی افسانہ نہیں پڑھتے تھے، بڑے شوق اور اشتیاق سے اسے پڑھا۔ اس افسانے کی اشاعت سے عظیم بیگ کی شہرت ایک دم پھیل گئی۔ شاہد صاحب نے ابھی "ساقی" نکالا ہی تھا۔ نیا نیا زمانہ تھا۔ مضمون نگار ملتے نہ تھے۔ حجاب امتیاز علی اور فرحت اللہ بیگ لکھنے لگے تھے۔ انھیں فکر ہوئی کہ کسی طرح عظیم بیگ کا پتا معلوم کریں۔ بہت کوشش کی، مگر پتا معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ عرصے بعد "ساقی" کی ڈاک میں ایک خط آیا۔ یہ عظیم بیگ کا خط تھا —— اس میں لکھا تھا کہ میرے پاس سب پرچے آتے ہیں، لیکن ساقی نہیں آتا کیا آپ ایک پرچہ نمونے کے طور پر بھیج سکتے ہیں؟ اس خط کے ساتھ ہی دونوں کے تعلقات اتنی تیزی سے بڑھے کہ دانت کاٹی روٹی بن گئے۔ عظیم بیگ دِلّی آتے تو شاہد صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ شاہد صاحب عظیم بیگ کے ہاں جاتے تو کئی کئی دن رہتے۔ راتوں باتیں کرتے۔ وہ افسانے لکھتے اور شاہد صاحب کو دے دیتے۔ ایک ہفتہ میں ناول لکھ دیتے۔ شاہد صاحب اسے شائع کرنے کے منصوبے بناتے۔ تپِ دق کے مریض تھے۔ دس سال بیمار رہے اور اسی بیماری میں بہترین افسانے لکھے۔ دھول دھپّا اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ اور یوں ہی مر گئے۔ جب ان کے مرنے کی اطلاع شاہد صاحب کو ملی تو ایسے روئے کہ اگر کوئی قریبی عزیز بھی مرتا تو نہ روتے۔ کئی برس تک سوگ مناتے

qasarulkutub.blogspot.com

رہے۔ اب بھی بیگم چغتائی آتی رہتی ہیں اور شاہد صاحب خلوص کے مارے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ شاید اُن کو دیکھ کر عظیم بیگ یاد آجاتے ہیں۔ دبے زخم اُبھر آتے ہیں۔ پُرانا دوست یاد آجاتا ہے۔ وہ دوست جو وقت سے پہلے مر گیا۔ جواں مرگ۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ دِلّی میں پلے بڑھے۔ بچپن جوانی وہیں گزرا۔ بال سفید ہوئے تو پاکستان آگئے۔ ۱۹۴۸ء سے پیر الٰہی کالونی میں مقیم ہیں۔ یہیں "ساقی" کا دفتر ہے۔ وضع وہی ہے جو دِلّی میں تھی۔ دِلّی میں سکون تھا، آسودگی تھی۔ کراچی میں نہ سکون ہے نہ آسودگی۔ بڑا کنبہ ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے اپنی ساری صلاحیتوں کو وضع داری کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی گا کر کماتے ہیں، کبھی لکھ کر۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ سدا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔ اب وہ ہیں اور ریڈیو پاکستان۔ اگر آپ کبھی ریڈیو پاکستان سے اور ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے، جس کا ایک یا دو بٹن لگے ہوں، سیاہ رنگ ہو، آنکھوں پر چشمہ ہو، بیڑی منہ میں ہو، سر پر سیاہ یا گہرے کتھئی رنگ کی جناح کیپ ہو، ذرا دائیں طرف کو جھکی ہوئی، بائیں طرف سے اُٹھی ہوئی اور وہ شخص کسی کا بازو پکڑے یا کندھے پر ہاتھ رکھے، چشمہ سے جھانکتی ہوئی چمک دار آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے، چھوٹی مہری کا پاجامہ پہنے، جس کے پائنچے کی مہری کے ڈورے نکلے ہوں اور ہلکا سا کشیدہ کاری کا جال بنا ہو، نیوکٹ کا جوتا ہو تو سمجھ لیجیے کہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔ دل چسپ انسان، فاضل مدیر، بہترین مترجم، صاحبِ زبان، دِلّی والے ـــــ اور حبیب ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی صبح کو ٹیلی فون پر ایک صاحب نے جنازے میں شرکت کے لیے اُن کا پتا پوچھا تو میں اُن کو پتا نہ بتا سکا۔

صاحبِ طرز ادیب

جدید نثر کی خرابی کا سبب یہ ہے کہ اس کے بیشتر لکھنے والے اپنی روایت سے ناواقف ہیں۔ وہ صرف انگریزی پڑھتے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں۔ آج کی نثر کے جملوں کی ساخت میں ایک ایسی اُلجھا دینے والی ترتیب ملتی ہے کہ آدمی اُسے روانی سے نہیں پڑھ سکتا۔ اِسی لیے عبارت میں وہ شگفتگی اور رچاوٹ نہیں ہے کہ پڑھنے والا پڑھے اور مزا لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُردہ لفظوں کو جملوں کی قبروں میں اُتار دیا گیا ہے جہاں سے نہ وہ بولتے ہیں اور نہ حرکت کرتے ہیں۔ یہ جدید نثر کا اسلوب ہے جو آپ کو ہر رسالے، ہر اخبار اور ہر اچھی بُری تحریر میں نظر آئے گا۔ زبان کی غلطیاں اب اس درجہ عام ہو گئی ہیں کہ اسکول اور کالج کے طلبہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ طرزِ بیان کی اہمیت پر نہ تو کالج مدرسوں میں زور دیا جاتا ہے اور نہ نثر نگار اسے قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ "خیال ہی سب کچھ ہے" یہاں کا نعرہ ہے اور جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسری زبان کے خیالات کو اُردو میں ان لفظوں کے ذریعے ادا کر دیا جائے جو خود نثر نگار کو معلوم ہیں۔ اس "ادائیگی" کے لیے نہ کسی کوشش و کاوش کی ضرورت ہے اور نہ خود اُردو زبان کے مزاج، روایات، اور ادب سے کسی واقفیت کی۔ یہی سبب ہے کہ نثر کے انبار کے انبار نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے زبان اور اس کی ساخت بھی بدل رہی ہے، اور ایسے میں اس عمل کا ہونا فطری بات ہے۔ اس بات کی صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن اس بدلنے کے عمل کے دوران ہی میں یہاں پوری احتیاط کی ضرورت ہے۔ جملوں کی ساخت بدلے، نئے لہجے زبان کے خمیر میں شامل ہوں، نئی ترکیبیں بنیں۔ لیکن یہ ساخت یہ ترکیبیں، یہ محاورے زبان کی تہذیب کا حصہ بن کر آئیں اور یہ کام ہمارے نثر نگار

qasarulkutub.blogspot.com

شعوری طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ جدید نثر میں نہ تو سبک رفتاری ہے اور نہ عام طور پر اس میں کوئی خوشبو آتی ہے۔ الفاظ سخت پتھروں کی طرح صفحوں پر بکھرے پڑے ہیں۔ آپ جدید نثر کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ وہ "شگفتہ" ہے۔ آپ کے پاس خیال بذاتِ خود کیسا ہی کیوں نہ ہو، اگر ادائیگی کے سانچے مضبوط نہیں ہیں، اگر الفاظ آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے، اگر آپ کو اس زبان کے محاوروں کے استعمال پر پوری قدرت نہیں ہے تو خیال کی قوّت لفظوں کا لباس پہنتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ آپ کا احساس ادھورا، آپ کا جذبہ نامکمل اور آپ کی بات بے اثر رہ جائے گی۔ اگر ادیب کی بات بے اثر ہو جائے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ پورے طور پر ادا نہ کر سکے تو اس کا خیال بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ بات کو بااثر طریقہ پر کہنے کی کوشش ہی میں ادیب لفظوں کو پوری احتیاط سے برتتا ہے۔ وہ اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ موثّر طریقہ پر ادا کرتا ہے۔ اس کے لیے اسے محنت کرنا ہوتی ہے اور ذرا سی بات کہنے کے لیے اسے بہت سا وقت لگانا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر لفظوں کی پری شیشے میں اُترتی ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت مصروف رہتے تھے، کوئی کالم لکھنا ہوتا تو چلتے پھرتے لکھ لیتے۔ اسی لیے وہ بات جو ایک کالم میں زیادہ موثّر طریقے سے کہی جا سکتی تھی، چار چار پانچ پانچ کالموں میں ادا ہوتی۔ جب اُن پر اعتراض کیا گیا تو اُنھوں نے صرف یہ کہا کہ ہاں بھئی یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن مختصر لکھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ بات کہہ کر انھوں نے اپنی کمزوری کا اعتراف تو ضرور کیا لیکن ساتھ ساتھ اسلوبِ بیان اور اِنشا پردازی کا ایک اہم نکتہ بھی بیان کر دیا۔ لفظوں کی فضول خرچی اور ان کا بے جا استعمال نثر نگار کا سب سے بڑا جُرم ہے۔ کم سے کم اور موزوں ترین الفاظ میں بات ادا کی جائے، اور یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب لکھنے والا زبان کے مزاج سے آگاہ، اس کی روایت، لفظوں کے صحیح معنی، اور محاوروں کے صحیح استعمال سے واقف ہو۔ جو لفظ یا محاورہ آئے وہ سچے موتی کی طرح روشنی دے۔ جیسے ایک اعلیٰ جنرل لاکھوں کی فوج کو سمجھ داری کے ساتھ اتحاد اور نظم و ضبط کے رشتے میں پروئے رہتا ہے اور جس کے ایک حکم پر ساری فوج کھڑی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اچھا نثر نگار بھی لاکھوں لفظوں کی فوج کا جنرل ہے، جو یہ جانتا ہے کہ کس لفظ کو کب اور کیسے استعمال کیا جائے۔ مختلف الفاظ اور محاوروں کی کیا روایت اور تاریخ ہے۔ ان کے اندر نئے معنی اور خیال و احساس کے بدلتے دھاروں کو کیسے داخل کیا جا سکتا ہے۔ اگر نثر نگار لفظوں کو برتنے کا سلیقہ نہیں رکھتا، اگر وہ لفظوں کے مزاج و معانی سے واقف نہیں ہے تو وہ اس طالب علم کی طرح ہو کر رہ جائے گا جس نے امتحان کے پرچے میں "پو پھٹنا" کے محاورے کو یوں استعمال کیا تھا کہ "ہائے افسوس سلمیٰ کی پو پھٹ گئی"۔

یہاں اتنی لمبی تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے تاکہ میں یہ کہہ سکوں کہ ایسے دور میں جہاں نثر کا یہ حال ہو، وہاں شاہد احمد دہلوی کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تھکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر آرام کر سکے جس کے میٹھے پھلوں کا ذائقہ ایک طرف اس کی بھوک مٹا سکے اور دوسری طرف اُس کے چٹخاروں سے رُوحانی کیف بھی حاصل کر سکے۔ میں شاہد صاحب کی تحریروں کو اسی ذائقہ اور چٹخارہ کے لیے پڑھتا ہوں تاکہ جدید نثر کے صحرائے اعظم کی تپش اور جھلسا دینے والی کڑی دھوپ سے کچھ دیر کے لیے عافیت پا سکوں۔ ان کی نثر میں مجھے خوشبو کا احساس ہوتا ہے، وہ خوشبو جو جدید نثر میں بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نثر کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ وہ شگفتہ ہے۔ پڑھنے والا اسے مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور بات پورے طور پر دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ اُن کی نثر سب سے الگ ہے۔ اسے تاش کے پتوں کی طرح مختلف نثر پاروں کے ساتھ پھانٹ دیجیے وہ خود ہی پکار اُٹھے گی "میں یہاں ہوں! میں یہاں ہوں"۔ آپ اُن کے وہ خاکے پڑھ جائیے جو انھوں نے خواجہ حسن نظامی، بیخود دہلوی، عنایت اللہ دہلوی، عظیم بیگ چغتائی، ناصر علی، میراجی اور منٹو پر لکھے ہیں۔ اُن کے وہ مضامین پڑھ جائیے جو انھوں نے دِلّی کی عید، چوک کی بہار، دِلّی کی برسات وغیرہ کے عنوان سے لکھے ہیں یا پھر اُن کے ترجمے پڑھ جائیے جو انھوں نے 'مغرب کے شاہکار افسانوں اور ڈراموں' کے کیے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ زبان و بیان پر قدرت رکھنے والا نثر نگار اپنی زبان کی روایت اور مزاج سے رشتہ ناتا برقرار رکھ کر بھی کیا کیا کام انجام دے سکتا ہے۔ ان کی نثر کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آدمی کو اپنی بات کس طرح کہنی چاہیے کہ

qasarulkutub.blogspot.com

شگفتگی بھی باقی رہے اور بات بھی پوری ادا ہو جائے۔ شاہد صاحب کی نثر میں وہ دل کشی اور شگفتگی ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔ اُن کی عبارت میں نہ تو انگریزی الفاظ آتے ہیں اور نہ فارسی عربی کے الفاظ نثر میں شان و شوکت اور گھن گرج کا اضافہ کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ محاوروں اور لفظوں کا اس قدر صحیح استعمال ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ جو آپ سے بات کرتا ہے، آپ کو تھپکتا بھی ہے، اور جھنجھوڑتا بھی ہے اور انھیں الفاظ کے ذریعے خیال و احساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

"دِلّی کی بپتا" ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی۔ اس میں لکھنے والے پر جو کچھ بیتا پڑی، جو کچھ واقعات اس نے اپنی آنکھ سے دیکھے اُن کو مِن و عن بیان کر دیا۔ ویسے تو بہت سے نامور ادیبوں نے بھی فسادات کے بارے میں افسانے، ناول، ڈرامے اور مضامین لکھے لیکن جو چیز آج بھی اُسے دِل چسپ بنائے ہوئے ہے وہ اس کا اندازِ بیان ہے۔ اس کی خوب صورت نثر ہے۔ اس کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان ہے جس کی سادگی میں وہ تہہ داریاں ہیں کہ آدمی اس سے ہر بار ایک نئی لذّت حاصل کرے۔ میں یہ بات صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ فسادات کے سلسلے میں جو چیزیں لکھّی گئیں۔ ان میں سے بیشتر کو اگر آج پڑھا جائے تو پڑھنا دوبھر ہو جائے۔ "دِلّی کی بپتا" آج بھی اسی طرح دِل کش اور دِل چسپ ہے۔ "دِلّی کی بپتا" سے اور کچھ نہیں تو اس بات کا تو پتا چلتا ہے کہ اچھی نثر وقت کی تلوار کی تیز دھار سے فن پارہ کو کس طرح محفوظ کر لیتی ہے۔ اندازِ بیان ہی وہ چیز ہے جو کسی تحریر کو ہمیشہ نیا رکھتا ہے۔ "آبِ حیات" تاریخی اعتبار سے کتنی ہی غلط سہی لیکن آج بھی یہ کتاب اُسی طرح تر و تازہ اور زندہ ہے اور اس کے پڑھنے میں آج بھی لُطف آتا ہے۔ "دِلّی کی بپتا" کی نثر آج بھی اسی طرح لطف دیتی ہے اور آج بھی دل پر اُسی طرح اثر کرتی ہے۔

دوسرے اور فنون کی طرح نثر کا بھی یہ کمال ہے کہ آدمی جو کچھ محسوس کرے اور جو کچھ تخیّل کے زور سے دیکھے اُسے اُسی شدّت اور جامعیت کے ساتھ لفظوں کی گرفت میں لے آئے تاکہ جب پڑھنے والا اُسے پڑھے تو اس کے اندر بھی وُہی شدّتِ احساس، جذبہ اور تصوّرِ خیال پیدا ہو جائے جو لکھنے والا پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس اعتبار سے بھی شاہد احمد دہلوی کی نثر نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں میں ایک مثال سے اپنی بات واضح کروں گا:

"ریل چلتی اور رُکتی رہی اور سب بیٹھے بیٹھے اُونگھنے اور سونے لگے۔ میں بھی کھڑکی سے سر باہر نکالے اُونگھ رہا تھا۔ دو بج رہے تھے اور لدھیانہ آنے والا تھا۔ گاڑی خوب تیز چل رہی تھی کہ ایک دم جھٹکا کھا کر رُک گئی۔ ساری گاڑی میں ایک شور برپا ہو گیا۔ جھٹکوں سے جا منیں سی کھُل گئیں۔"

(دِلّی کی بپتا)

بات سیدھی سادی ہے۔ نہ اس میں افسانویت ہے اور نہ مبالغہ کے ذریعہ کسی قسم کی شِدّت دکھائی گئی ہے۔ لیکن ریل کے ڈبّے اور مسافروں کی اُس حالت کو جو ایک دم جھٹکا کھا کر رُکنے سے ڈبّے اور مسافروں کی ہُوئی، نثر نگار نے "جا منیں سی کھُل گئیں" کے مختصر سے جُملے سے ادا کیا ہے۔ جس سے پڑھنے والے کے سامنے ایک دَم جھٹکا کھا کر گاڑی رُکنے کی حالت کی مکمّل تصویر آ جاتی ہے۔ شاہد صاحب کی نثر کی یہ وہ خوبی ہے جو اُن کے ہاں اثر آفرینی کا جادُو جگا دیتی ہے۔

زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ ان کا خاندانی وصف ہے جو اپنی پوری رچاوٹ اور ایک نئے توازن کے ساتھ اُن کی نثر میں آ گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر میں "دِلّی اسکول" کا وہ سارا بانکپن موجود ہے جو ہمیں الگ الگ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ہاں نظر آتا ہے۔ آزاد کی نثر میں استعاروں کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ وہ ایک بات کو کئی کئی استعاروں کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔ اُن کی عبارت رنگین اور تخیّل کے زور سے شوخ و شگفتہ ہوتی ہے۔ نذیر احمد محاوروں کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر صاف، طرزِ بیان رواں، بے ساختہ اور واضح ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے ہاں نہ استعاروں کی کثرت ہے اور نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں نہ وہ شوخی ہے جو آزاد کے ہاں نظر آتی ہے۔ اور نہ وہ ظرافت جو نذیر احمد کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی نثر کے امکانات جس نقطہ پر ملتے ہیں وہاں سے شاہد احمد دہلوی کی نثر پیدا ہوتی ہے، جس میں استعارے، محاورے، روزمرّہ اور ٹکسالی زبان ایک خاص توازن کے ساتھ ان کے مزاج کی سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک نئے لہجے

qasrulkutub.blogspot.com

کو جنم دیتی ہے۔ اسی لیے اُن کی نثر میں محاوروں کا استعمال موضوع کی مناسبت کے ساتھ خودبخود ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ ایسے ٹھاٹ باٹ اور ٹھسّے سے جماؤ کے ساتھ آتے ہیں کہ انھیں کسی دوسرے محاورہ یا لفظ سے نہیں بدلا جا سکتا۔ ان کی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے، جس میں شگفتگی اور بانکپن ایک ایسی سنجیدگی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں کہ ان کی نثر میں خوبصورت توازن بھی ہے اور خوش انداز سنجیدگی بھی۔ نہ وہ بہت دُور تک نذیر احمد کے ساتھ چلتے ہیں اور نہ محمد حسین آزاد کے ساتھ، لیکن دونوں کو اپنے ساتھ لیے دونوں کے مزاجوں کو اپنے مزاج کے خمیر میں گوندھ کر ایک نیا مرکّب تیار کرتے ہیں اور یہی وہ امکان ہے جو انھیں صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ مَیں اپنی اس بات کو ایک اقتباس سے واضح کرتا چلوں تو شاید زیادہ مناسب ہو گا:

اللہ بخشے میر ناصر علی دِلّی کے ان وضع دار شرفا میں سے تھے جن پر دِلّی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ "بزرگ" مَیں نے انھیں اس لیے کہا ہے کہ مَیں نے جب سے ہوش سنبھالا، انھیں بزرگ ہی دیکھا۔ سُوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔ خشخاشی ڈاڑھی پہلے تل چاولی تھی، پھر سفید ہو گئی تھی۔ کتری ہوئی لبیں، پوپلا مُنھ، دہانہ پھیلا ہُوا، بے قرار آنکھیں، ماتھا کھلا ہُوا بلکہ گُدّی تک ماتھا ہی ماتھا چلا گیا تھا۔ جوانی میں سرو قد ہوں گے۔ بڑھاپے میں کمان کی طرح جُھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو پیچھے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ وار جُھوم کر چلتے تھے۔ مزاج شاہانہ، وضع قلندرانہ، ٹخنوں تک لمبا کُرتا۔ گرمیوں میں موٹی ململ یا گاڑھے کا اور جاڑوں میں فلالین یا ڈائل کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوتی تھیں جنھیں میر صاحب کہتے تھے "یہ میرے چار نوکر ہیں"۔ گلے میں پٹکا یا گلوبند، سر پر کبھی کپڑے کی پچخ گول ٹوپی اور کبھی صافہ، گھر میں رُوئی کا کنٹوپ بھی پہنتے تھے اور اس کے پاکھے اُلٹ کر کھڑے کر لیتے تھے۔ جب چغہ پہنتے تو عمامہ سر پر ہوتا۔ اِک بَرا پاجامہ، ازاربند میں کُنجیوں کا گچھا۔ پاؤں میں نری کی سلیم شاہی۔ کسی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جُوتا پاؤں

میں اڑا لیتے۔" (گنجینۂ گوہر)

مَیں نے یہاں ایک ایسا اقتباس پیش کیا ہے جو بیانیہ انداز لیے ہوئے ہے۔ نثر کے ایسے ٹکڑے آپ کو نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے ہاں بھی ملیں گے لیکن اس اقتباس کو اگر آپ اِن نثر پردازوں کی ایسی ہی تحریروں کے ساتھ رکھ کر پڑھیں تو آپ کو شاہد احمد دہلوی کی نثر میں اُن دونوں کی گُونج ضرور سُنائی دے گی۔ لیکن ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہو گا کہ یہ اُن دونوں سے بالکل مختلف بھی ہے۔ نثر نگاری کی اس روایت کو اس طور پر برتنے کا ڈھنگ مجھے صرف شاہد احمد دہلوی کی نثر میں نظر آتا ہے۔ جس میں نذیر احمد اور آزاد موجُود بھی ہیں اور نہیں بھی۔

شاہد احمد دہلوی کی نثر کی ایک خُوبی یہ ہے کہ اس میں نہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ بوجھل پن پیدا کرتے ہیں اور نہ جملوں کا ڈھیلا پن روانی کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سُلجھا ہُوا انسان روزمرّہ کی زبان میں بات چیت کر رہا ہے۔ بات چیت کے انداز میں ادبی نثر لکھنا کتنا دُشوار ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اچھی نثر اور اچھی عبارت لکھنے کی کوشش کی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر کی تین بُنیادی خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ وہ محاوروں کو ایسے برمحل طریقے سے استعمال کرتے ہیں کہ عبارت کِھل اُٹھتی ہے اور حُسن و دِلکشی کے ساتھ معنی و مفہُوم کی صاف اُجلی تصویر ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اُن کے لہجے میں ایسا سبھاؤ، ایسی مٹھاس اور گھلاوٹ ہے کہ بات چیت کا یہ انداز ہمارے وجُود پر جادُو کا سا اثر کرتا ہے اور ہم اس نثر کو پڑھ کر اس مسرّت سے ہم کنار ہوتے ہیں جو ادب کی بنیادی صفت ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر کی یہ خصُوصیات ان کی ہر تحریر میں مل سکتی ہیں۔ گرمی کا موسم ہم سب نے دیکھا اور اس کی شدّت ہم سب نے جھیلی ہے۔ اب اس گرمی کا ذکر شاہد احمد کی زبان سے سُنیے:

"اب سے دُور دِلّی میں ایک سال ایسا سُوکھا پڑا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ پکار اُٹھی۔ جھلستا ہُوا سورج، جھلستی ہُوئی زمین، در و دیوار سے آگ برس

رہتی تھی۔ گرمی کے مارے یہ بُرا حال کہ پسینہ جو چوٹی سے بہا تو ایڑی تک جا پہنچا۔ پھولوں سے لال کھلائے جاتے اور گلاب سے گال مُرجھائے جاتے تھے۔ لُو کی وہ شدّت کہ زمین سے آسمان تک بھاڑ سا جُھنکتا رہتا۔ بازار میں سے اچھا بھلا آدمی چلا جا رہا ہے کہ پٹ سے گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ معلوم ہُوا کہ لُو لگی۔ بیچارے نے ہچکا بھی نہ کھایا۔ زمین کی تپش کا یہ حال کہ مٹر کے دانے پھینکو تو بھُن کر پھٹنے لگیں۔ شہر کے آس پاس تمام ندی نالے، تالاب چقر سُوکھ گئے تھے۔ رات کو حبس ایسا ہوتا کہ دم گھٹا جاتا۔ پنکھا جھلتے جھلتے ہاتھ ٹوٹے جاتے۔ چارپائیاں ابھی بھگوئی ہیں، ابھی دیکھو تو بان خشک پڑا ہے۔ کمر لگانا مشکل، کروٹ لینا دشوار۔ مگر دلّی کے زندہ دل ایسے سمے میں بھی کب چُوکتے ہیں۔ ایک صاحب لہک لہک کر یہ شعر پڑھ رہے تھے:

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سُو بدلتے ہیں
جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں (اُجڑا دیار)

یہ طرزِ ادا چوں کہ ان کی سب تحریروں میں مشترک ہے اس لیے ہم شاہد احمد دہلوی کو صاحبِ طرز ادیب کہہ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو صاف ستھری، آسان اور خوب صورت اردو پڑھنا، سیکھنا یا لکھنا چاہتے ہیں، شاہد احمد دہلوی کی نثر ان کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولوی عبدالحق

دامانِ دِلّی میں ایک قصبہ ہے ہاپڑ۔ اُس کی دو چیزیں مشہور ہیں، پاپڑ اور مولوی عبدالحق۔ —— پاپڑ ہر شہر میں بنتے ہیں مگر جو مزہ ہاپڑ کے پاپڑ میں تھا کسی اور جگہ کے پاپڑ میں نہیں تھا۔ عبدالحق بھی بے شمار پیدا ہوئے مگر مولوی عبدالحق کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سَن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

میرے والد کے پاس اُردو کے اکثر رسالے آتے تھے، انھی میں ایک رسالہ "اُردو" بھی تھا جس کے ایڈیٹر عبدالحق تھے۔ میں اُس زمانے میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ فارسی اور اُردو ابّا مجھے خود پڑھاتے تھے۔ اس لیے عمر کے لحاظ سے اُردو کی زیادہ ہی چٹیک مجھے ہو گئی تھی۔ میں کالج کی ابتدائی جماعتوں میں تھا کہ اسی رسالہ اُردو میں "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" کے عنوان سے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون چھپا۔ میری چڑھتی جوانی تھی اور مزاج کی افتاد بھی جذباتی تھی۔ وہ محبت اور خلوص تو دکھائی نہیں دیا جو اس مضمون کے لفظ لفظ سے ٹپکتا تھا۔ ہاں وہ ایک ایک بات نشتر بن کر دِل میں چُبھ گئی جس سے مولوی نذیر احمد کی سُبکی ہوتی تھی۔ چھٹیوں میں جب میں دِلّی گیا تو ابّا پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ اور وہ لکھنے پڑھنے سے معذور ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے بڑے بھائی منذر احمد سے اس مضمون کا ذکر کیا۔ وہ اُس وقت قانون پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "بھائی! اس مرزا اور مولوی پر اہانت کا مقدمہ دائر کر دو۔" بھائی سنجیدہ اور بُردبار آدمی ہیں۔ بولے "تم نے شاید اس مضمون کو رَوا رَوی میں پڑھا ہے، جُزوی طور پر بعض باتیں اس میں ایسی قابلِ اعتراض ہیں مگر پورے مضمون کے تاثر میں اُن کی شدّت باقی نہیں رہتی۔ دادا ابّا کے بارے میں جو باتیں انھوں نے

qasrulkutub.blogspot.com

لکھتی ہیں، بہت کچھ صحیح ہیں۔ البتہ زیبِ داستان کے لیے کہیں کہیں مبالغے سے بھی کام لیا ہے۔ تم اس مضمون کو دوبارہ ٹھنڈے دل سے پڑھو اور اس نظر سے پڑھو کہ یہ تمھارے دادا کی کہانی نہیں ہے، ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ہے۔" میں نے اس مضمون کو پھر پڑھا۔ واقعی اب اتنا ناگوار نہیں گزرا۔ اور پھر کچھ عرصے بعد پڑھا تو مرزا فرحت اللہ بیگ سے غائبانہ اُنس ہو گیا۔ اور جب میں نے جنوری ۱۹۳۰ء میں "ساقی" جاری کیا تو مرزا صاحب سے خط و کتابت بھی شروع ہو گئی اور وہ "ساقی" کے لیے مضامین بھی بھیجنے لگے۔ یوں فرحت اللہ بیگ کے سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب کو میں نے پہلی بار جانا پہچانا۔

۱۹۳۰ء کے بعد میں کئی دفعہ حیدرآباد گیا مگر مولوی صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکا۔ مولوی صاحب اورنگ آباد میں رہتے تھے اور انجمن کا دفتر بھی وہیں تھا۔ ایک بات پر مجھے بڑا اچنبھا ہوتا تھا کہ غیر مُلکی (غیر حیدرآبادی) ہوتے ہوئے بھی مولوی عبدالحق اتنی طویل مُدّت تک حیدرآباد میں کیسے جمے رہے؟ ان کے پیش رو محسن الملک، وقار الملک، مولوی نذیر احمد اور مولوی صاحب کے ہم عصر مولوی ظفر علی خاں اور مولانا عبدالماجد دریابادی، اور خبر نہیں کون کون اس ریاست میں اپنے قدم نہیں جما سکے اور کتنے ہی بڑے آدمیوں کو خارج البلد کیا گیا۔ مگر مولوی صاحب تھے کہ ڈٹے ہوئے تھے، اور ترقی کرتے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اپنی مدافعت میں وہی ہتھیار استعمال کیے ہیں جو مُلکی لوگ حملہ کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے حیدرآباد کے تمام بڑے لوگوں کو اپنی مُٹھی میں کر لیا تھا اور وزیرِ اعظم حیدری کے تو ناک کے بال بن گئے تھے۔ مگر مولوی صاحب صرف اپنا بچاؤ ہی نہیں کرتے رہے، انھوں نے ریاست کے بڑے بڑے کام بھی کیے۔ انجمن ترقیِ اردو کو اتنا فروغ دیا کہ انجمن سارے ہندوستان کے لیے اردو کا مرکز بن گئی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کا منصوبہ مولوی صاحب ہی نے بنایا تھا۔ جب یہ اردو یونی ورسٹی بنی تو اس کے لیے دارالترجمہ قائم کیا جس میں اعلیٰ قابلیت کے مترجم جمع کیے۔ اس دارالترجمہ نے تمام علوم و فنون کو اردو میں منتقل کر دیا۔ اور یہ مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو دکھایا کہ

اردو بھی کامیاب ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم مولوی صاحب ہی تھے۔ جب اُن کی دوسری مصروفیات بڑھیں تو منشی ذکاء اللہ دہلوی کے صاحب زادے مولوی عنایت اللہ دہلوی کو مولوی صاحب نے اپنا جانشین مقرر کیا۔ مولوی صاحب کی طرح یہ صاحب بھی علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹ تھے۔ مولوی صاحب کی طرح انھوں نے بھی سرسیّد کی آنکھیں دیکھی تھیں اور کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ترجمہ بہت عُمدہ کرتے تھے۔ اتنا عمدہ کہ ایک خط میں سرسیّد نے منشی ذکاء اللہ کو لکھا کہ "تمھارا لڑکا تم سے اچھا ترجمہ کرتا ہے۔"

مولوی عبدالحق صاحب نے شادی ساری عمر نہیں کی۔ یہ بھی سُنا تھا کہ ایک دفعہ گھر والوں نے گونتھ گانٹھ کے ان کی شادی کر دی تھی تو مولوی صاحب نے حیدرآباد واپس پہنچ کر طلاق نامہ بھیج دیا تھا۔ اصل میں اُن کی شادی تو اردو سے ہو چکی تھی اور اردو سے انھیں اتنی محبّت تھی کہ وہ اُس پر سوکن لانا نہیں چاہتے تھے۔ ساری عمر اردو ہی کی خدمت میں گزار دی۔ اگر وہ بیوی بچّوں کے بکھیڑوں میں اُلجھ جاتے تو آج اردو کو وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو اُسے حاصل ہے۔ اردو سے اُن کے شدید عشق کا اظہار اُس وقت ہوا جب گاندھی جی نے ہندوستانی کا اشتغلہ چھوڑا۔ جب گاندھی جی سے مولوی صاحب نے ہندوستانی کی وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا: "ہندی اتھوا ہندوستانی" یعنی وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی بن جائے گی۔ مولوی صاحب نے گاندھی جی کو بتایا کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہ اردو ہے اور یہی زبان ہندوستانی ہے۔ مگر گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے بھرّے میں آئے ہوئے تھے۔ بولے: "اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے بڑھائیں اور زندہ رکھیں۔" ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کی زبان سے جب ہٹ دھرمی کی یہ باتیں مولوی صاحب نے سنیں تو مولوی صاحب کو بھی حرارہ آ گیا۔ گاندھی جی کو خوب آڑے ہاتھوں لینے کے بعد بتایا کہ اردو نہ تو مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی زبانیں تو عربی اور فارسی ہیں۔ قرآن خطِ نسخ میں لکھا جاتا ہے، اردو نستعلیق

darulkutub.blogspot.com

ہیں۔ مگر گاندھی جی بھی ڈھٹائی سے اپنی بات پر جمے رہے اور ہندی اُرفِ ہندوستانی کی رَٹ لگاتے رہے۔ مولوی صاحب نے اورنگ آباد پہنچ کر ایک طویل بیان شائع کر کے تمام اخباروں اور رسالوں کو بھیج دیا۔ اس بیان نے سارے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا۔ بات تھی سچّی، بہت سے ہندوؤں نے بھی ساتھ دیا اور گاندھی جی کی تھُڑی تھُڑی ہونے لگی۔ مگر بڑے آدمیوں کا کچھ نہیں بگڑتا، اور گاندھی جی کو تو اُن کی قوم نے مہاتما بنا رکھا تھا، پھر لالوں کے لال ہو گئے۔ دھوبی بیٹا چاندسا، سیٹھی پیارغ۔

جب گاندھی جی اُردو کی جان کے لاگو ہو گئے۔ اور ہندوستانی کی آڑ میں ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے پر تُل گئے تو مولوی صاحب نے انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے دِلّی منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مولوی صاحب دِلّی آئے اور دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کرایہ پر لے لی۔ اس وقت دریا گنج میں سب سے بڑی کوٹھی ڈاکٹر انصاری ہی کی تھی۔ یہ بڑی تاریخی کوٹھی تھی۔ جب تک ڈاکٹر انصاری زندہ رہے اس کوٹھی میں کانگریس کے تمام بڑے لیڈر جمع ہو کر مشورے کرتے رہے۔ اسی کوٹھی کو مولوی صاحب نے اُردو کا گڑھ بنایا اور انجمن کا دفتر اس میں منتقل کر دیا۔ دِلّی والوں نے مولوی صاحب کا شان دار استقبال کیا اور ایک جلوس کی شکل میں انھیں اسٹیشن سے کوٹھی تک لائے۔ یہ جگہ بھی انجمن کے دفتر کے لیے عارضی تھی۔ مولوی صاحب نے نئی دِلّی میں ایک پُرسکون مقام پر بہت وسیع زمین کے لیے درخواست دے دی تھی۔ بعد میں یہ زمین انھیں مل گئی تھی۔ اس پر انجمن کی ایک شان دار عمارت بنوانے کا ارادہ تھا مگر انجمن کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ عمارت بنوا لیتی۔ مولوی صاحب نے اس کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا مگر یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا اور ۱۹۴۷ء کی غارت گری شروع ہو گئی۔

یہ منصوبہ یوں اور بھی پورا نہ ہو سکا کہ سر اکبر حیدری جب تک حیدرآباد کے وزیرِ اعظم رہے انجمن کو ریاست کی طرف سے سالانہ امداد ملتی رہی۔ سر اکبر حیدری کے بعد نواب چھتاری وزیرِ اعظم بنے۔ اُن کے عہد میں بھی ریاستی امداد بے چُون وچرا جاری رہی۔ مگر جب سر مرزا اسماعیل برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے انجمن کی امداد روک دی۔ یہ صاحب تھے تو مسلمان مگر انگریزوں اور ہندوؤں کے پٹھو تھے۔ پھر مولوی صاحب کے دِلّی منتقل ہوتے

ہی دکن کے چند مقامی با اثر لوگوں نے انجمن کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی اور اپنی ایک ڈیڑھ اینٹ کی انجمن بنا کر مُلکی اور غیر مُلکی آگ کو بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ سر مرزا نے مخالف گروہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی انجمن کی امداد بند کر دی تھی۔ مولوی صاحب آسانی سے شکست مان لینے والے آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے فوراً ایک کانفرنس بُلائی اور سر مرزا کی اِس حرکت کو متفقہ طور پر غلط قرار دیا گیا۔ اس کے ایک اجلاس میں مَیں بھی شریک ہُوا تھا اور مولوی صاحب نے اسی اجلاس میں اعلان کیا تھا کہ "مَیں اپنا کُل اثاثہ انجمن کی نذر کرتا ہُوں۔" اُس وقت معلوم ہُوا تھا کہ یہ اثاثہ پانچ لاکھ کا تھا۔

مولوی صاحب نے ایک کُل ہند کانفرنس علی گڑھ میں بھی کی تھی جس میں سر راس مسعود بھی شریک ہُوئے تھے۔ مَیں نے راس مسعود کو پہلی اور آخری بار اسی کانفرنس میں دیکھا تھا۔ بڑے قدآور دیو ہیکل آدمی تھے۔ مگر بھدّے بھونڈے نہیں لگتے تھے۔ ذہانت ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ اور وجاہت اُن کی پیشوائی کرتی تھی۔ ایک اجلاس ختم ہُوا تو مولوی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہُوئے ہال میں سے باہر آئے۔ مولوی صاحب میانہ قد کے آدمی تھے۔ مگر راس مسعود کے پہلو میں بونے نظر آ رہے تھے۔ مولوی صاحب ان سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے کوئی اپنے سے بہت چھوٹے سے باتیں کرتا ہے۔ یہی مولوی صاحب تو تھے جنھوں نے دیکھا تھا کہ سر سیّد اپنے پوتے راس مسعود کو بہلا کر سُلانے کے لیے لوری دے رہے تھے اور اس منظر کو دیکھ کر ہنستے ہُوئے باہر بھاگ گئے تھے۔

اُردو، ہندی اور ہندوستانی کی بحث کسی طرح طے نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ گاندھی جی جیسے مہاتما دھرم نکال کر کہنے لگے تھے کہ مَیں جو زبان بولتا ہُوں، وہی ہندوستانی ہے۔ مولوی صاحب نے ان کے جواب میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ مَیں جو زبان بولتا ہُوں یہی ہندوستانی ہے۔ رہی ہندی، تو ہندی کے اتنے الفاظ نہیں ہیں جتنے کہ اُردو میں۔ آخر میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہندوستانی اس زبان کو موسوم کیا جائے جو عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط، دونوں میں لکھی جائے۔ لُطف کی بات یہ تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب تقریر کرتے تھے تو فصیح و بلیغ اُردو میں، اور اچانک جب انھیں خیال آ جاتا تھا تو ایک آدھ

qaisarkutub.blogspot.com

لفظ ہندی کا بھی بول جاتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو پر جب تقریر نشر کرتے تھے تو اُن کا مسوّدہ اُردو میں لکھا ہُوا ہوتا تھا۔ رہے گاندھی جی، تو انھیں نہ تو ہندی آتی تھی اور نہ اُردو۔ ایک دفعہ "تیج" اخبار کے ایڈیٹر نے اِن سے اپنے اخبار کی کسی خاص اشاعت کے لیے مضمون مانگا تو گاندھی جی نے اُردو میں انھیں خط لکھا: "بھائی دیش بندھو۔ جانو کہ میں سُوکھ گیا ہُوں۔" اس خط کا عکس اخبار میں شائع کیا گیا تھا، اور ایسا لگتا تھا کہ روشنائی میں سے مکوڑا نکال کر کسی نے کاغذ پر پھینک دیا ہے۔

گاندھی جی سے ٹکّر لینے کے بعد مولوی صاحب اُردو کے قائدِ اعظم بن گئے تھے اور بابائے اُردو کہلانے لگے تھے۔ یہ صرف مولوی صاحب ہی تھے جو اُردو کے لیے لڑتے پھرتے تھے۔ اور اُردو کے پروپیگنڈے کے لیے کسی سے ایک پیسہ طلب نہیں کرتے تھے۔ اِن کے پیرِ طریقت سرسیّد احمد خاں سارے مُلک میں گھوم پھر کر چندے اکٹھا کرتے تھے۔ مگر مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ کسی سے چندہ مانگتے مجھے شرم آتی ہے۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ چناں چہ سارے اخراجات مولوی صاحب اپنی پنشن سے پُورے کرتے تھے۔

مولوی صاحب خاصے کھُرّے آدمی تھے۔ وہ کسی سے مِلنے جُلنے کے قائل نہیں تھے۔ جب وہ دِلّی آکر رہ پڑے تو انھوں نے کسی سے خود جاکر مِلنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اگر کوئی شخص غائبانہ عقیدت کے باعث اِن سے مِلنے چلا جاتا تو خوش واپس نہ آتا۔ اوّل تو مولوی صاحب تک اُس کی رسائی نہ ہوتی اور باہر ہی باہر یہ کہہ کر اُسے ٹال دیا جاتا کہ مولوی صاحب کچھ ضروری کام کر رہے ہیں، اِس وقت نہیں مل سکتے۔ یا عقیدت مند شخص اس پایہ کا ہوتا کہ اُسے ٹالا نہ جا سکتا ہو تو مولوی صاحب اُس سے مجبوراً مل لیتے۔ مگر اس رکھائی سے کہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرتے۔ لہٰذا مُلاقات دو چار ہی منٹ میں ختم ہو جاتی۔ اگر اُسے کوئی معاملے کی بات کرنی ہوتی تو اُسے کیفی صاحب اور ہاشمی فرید آبادی صاحب کے پاس بھیج کر اپنا پیچھا چھُڑا لیتے۔ اس عادت کی وجہ سے مولوی صاحب بد مزاج اور مغرُور سمجھے جانے لگے تھے۔ مولوی صاحب کام کے آدمی تھے، مِلنے جُلنے سے اِن کے کام میں حرج ہوتا تھا۔ اگر وہ رکاوٹ نہ ڈالتے تو مِلنے جُلنے ہی کے ہو کر رہ جاتے۔ مولوی صاحب دِلّی آکر خاصے بُوڑھے ہو گئے تھے مگر میں اِن سے

مِلنے نہیں گیا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ میں اُن کے کھُرّے پن کی کہانیاں سُن چکا تھا۔ اسی اثنا میں ایک دن مولوی صاحب کا پیغام پہنچا کہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ جو صاحب یہ پیغام لائے تھے میں نے اِن سے پوچھا کہ "آج کیا جاتی دُنیا مولوی صاحب نے دیکھی کہ یاد فرمایا؟" انھوں نے ہنس کر بتایا کہ "مسٹر فضل احمد کریم فضلی آئے ہُوئے ہیں۔ انھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ شاہد صاحب سے مِلنا چاہتا ہُوں، انھیں بُلوائیے۔" فضلی صاحب سے میرا ربط قائم ہو چکا تھا، اور وہ "ساقی" کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ میں نے کہا۔ "میں ضرور آؤں گا۔" وقتِ مقررہ پر میں انجمن کے دفتر پہنچا۔ صحن میں کُرسیاں دائرے کی شکل میں لگی ہوئی تھیں۔ پندرہ سولہ حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ میں پہنچا تو کسی نے پذیرائی نہیں کی۔ میں خاموشی سے کیفی صاحب کے پاس ایک خالی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ کیفی صاحب سے میری یاد اللہ تھی، اُن سے گاہے گاہے بات کرتا رہا۔ سامنے مولوی صاحب اور فضلی صاحب بیٹھے ہُوئے تھے۔ مگر ان دونوں میں سے ایک بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے فضلی صاحب کو یُوں پہچان لیا کہ اِن کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ قاعدہ ہے کہ میزبان اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور ہر مہمان کا تعارف بھی کراتا ہے۔ مگر یہاں یہ کچھ نہیں تھا۔ طبیعت کو یہ کسر میری بہت اکھری۔ تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں اور فضلی صاحب کا کلام سُنایا گیا۔ اس کے بعد اطلاع آئی کہ کھانا لگ گیا ہے۔ مولوی صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے: "چلیے کھانا تیار ہے۔" سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کی طرف چلنے لگے۔ میں نے باہر کا رُخ کیا اور مولوی صاحب کی نظر بچا کر کھسکنے کا ارادہ کیا۔ اِدھر کیفی صاحب کھٹکے اور اُدھر مولوی صاحب نے بھی تاڑ لیا۔ کیفی صاحب نے پوچھا۔ "اُدھر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اِدھر چلیے۔" میں نے کہا۔ "جب مولوی صاحب مجھے جانتے ہی نہیں تو مجھے بلایا کیا ضرور تھا۔" اتنے ہی میں مولوی صاحب بھی آپہنچے۔ کیفی صاحب نے کہا۔ "یہ شاہد احمد صاحب ہیں، ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے۔" مولوی صاحب نے مُسکرا کر میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور بولے۔ "آیئے۔" اور اسی طرح مجھے کمرے میں لے جاکر فضلی صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا اور بولے "لیجیے، یہ ہیں آپ کے شاہد صاحب۔" فضلی صاحب بڑی گرم جوشی سے گلے مِلے اور بولے: "آپ تو کافی

qasarulkutub.blogspot.com

دیر کے آئے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جی ہاں، مگر آپ تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔" بات آئی گئی ہو گئی اور ہنسی خوشی کھانا کھایا۔ فضلی صاحب نے میرے گھر کا پتا پوچھا اور دو ایک دن بعد مجھ سے ملنے تشریف لائے اور مجھے اپنا اور بھی گرویدہ کر گئے۔ مولوی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، مگر نہ انھوں نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے ان سے۔ اس کے بعد بھی بیسیوں دفعہ ان سے آمنا سامنا ہوا مگر جم کر گفتگو اُن سے کبھی نہیں ہوئی۔ میرا نام تک ان کو یاد نہیں رہتا تھا۔ کسی سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا آیا ہے یا نہیں۔

مولوی صاحب بڑے نفیس مزاج آدمی تھے، عمدہ اور قیمتی کپڑا پہنتے تھے۔ شیروانی، ترکی ٹوپی اور ایک بَرا پاجامہ۔ ساری عمر ان کا یہی لباس رہا۔ سوٹ پہنے ہوئے نہ تو کبھی انھیں دیکھا اور نہ کوئی تصویر ہی ایسی دیکھی جس میں سوٹ پہنے ہوں۔ کھانا اچھا کھاتے تھے۔ اور ایک ہی وقت میں کئی قسم کا ہوتا تھا۔ پھل بھی ضرور ہوتے تھے۔ ان کے مقربین میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ بمبئی میں کسی رئیس نے مولوی صاحب کی دعوت کی۔ میزبان کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب کھانے کے بعد موسم کا پھل ضرور کھاتے ہیں۔ لہٰذا کھانا ختم ہو جانے کے بعد میزبان نے آواز لگائی۔ "فروٹ لاؤ۔" تو ملازمین نے ڈشوں میں گنڈیریاں لا کر رکھ دیں۔ مولوی صاحب متبسم ہوئے مگر اپنے میزبان کا دل رکھنے کے لیے ایک آدھ گنڈیری لے لی۔ وہاں سے رخصت ہونے کے بعد مولوی صاحب اپنے ساتھیوں سے پوچھتے رہے اور ہنستے رہے کہ "کہو تم نے کتنے فٹ پھل کھایا؟ اور تم نے کے گز پھل نوشِ جاں فرمایا؟"

مولوی صاحب کھانے کے وقت کھانے کے تمام آداب کا خیال رکھتے تھے، لقمہ بہت بڑا نہ ہو، کھانے میں چپڑ چپڑ کی آواز نہ ہو۔ سنے ہوئے ہاتھ سے پانی نہ پئیں، زیادہ عجلت سے نہ کھاتے، زور سے ڈکار نہ لیتے وغیرہ۔ ایک بھلے آدمی کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے لگے۔ مولوی صاحب نے استکراہ کے ساتھ اُن کی طرف دیکھا۔ اور جب وہ اپنی انگلیاں چاٹ چکے تو اپنا ہاتھ بھی اُن کی طرف بڑھا دیا۔ اور بولے۔ "بسم اللہ۔" اس پر سب ہنس پڑے اور اس غریب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ایک اور صاحب تھے جنھیں مولوی صاحب نے چائے پر بلایا تھا۔ چائے

آئی تو اُس کے ساتھ کچھ فینسی بسکٹ بھی تھے۔ اُن صاحب نے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا۔ مولوی صاحب ایک دم سے لاحول پڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ مہمان کا مُنھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے ناراضگی سے کہا۔ "لندن میں تین سال تک تم جھک مارتے رہے، یہ بسکٹ چائے میں ڈبو کر کھانے کے ہیں؟" یہ کہہ کر الگ جا بیٹھے اور چائے کو پھر ہاتھ نہ لگایا۔ مجھے جب بھی مولوی صاحب کے عصرانوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تو میں اُن سے دُور بیٹھتا تھا اور ہمیشہ مجھے یہ دونوں واقعات یاد آ جاتے تھے۔

حیدر آباد میں مولوی صاحب بہت بڑی کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے، صرف ایک آدمی اُن کے ساتھ بطور میرِ انتظام رہتا تھا۔ اتنی بڑی ڈھنڈار کوٹھی میں مولوی صاحب اکیلے ہی رہتے تھے۔ مگر کھانا عموماً اکیلے نہیں کھاتے تھے۔ دو چار دوست شام کی چائے اور رات کے کھانے پر ضرور بلائے جاتے تھے۔ اور یہ وہ لوگ ہوتے تھے جن سے مولوی صاحب کھُل کر باتیں اور مذاق کر سکتے تھے۔ یوں تو مولوی صاحب بہت لیے دیے رہتے تھے۔ کم بولتے تھے اور کوئی بات ہنسی کی نہیں کرتے تھے۔ مگر سُنا ہے کہ نجی صحبتوں میں اپنے بے تکلف دوستوں سے خوب ہنستے بولتے تھے۔ پطرس نے ایک دفعہ بتایا کہ مولوی صاحب جب کھُل جاتے تو غضب کے زندہ دل ہو جاتے تھے اور "جھگڑ لڑتے ہیں تو مولوی صاحب کا جواب ہی نہیں ہے۔" کہاں تک گھُٹے گھُٹے رہتے؟ وہ بھی تو آخر انسان ہی تھے۔ سر اکبر حیدری تو مولوی صاحب کو چھیڑتے تھے اور جب مولوی صاحب انھیں ہو ٹنٹوں پر دھر لیتے تو خوب ہنستے۔ وتا تریہ کیفی سے بھی مولوی صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ کیفی صاحب مولوی صاحب سے کوئی آٹھ دس سال بڑے تھے مگر دونوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر کی جگہ نکلی تو مولوی صاحب نے کیفی کو اس جگہ پر لانے کی کوشش کی مگر ملکیوں نے اخباروں اور پوسٹروں کے ذریعے قیامت برپا کر دی اور کیفی صاحب کا تقرر اس جگہ پر نہیں ہو سکا۔ لہٰذا مولوی صاحب جب تک حیدر آباد میں رہے اُردو کے پروفیسر بھی رہے۔ جب مولوی صاحب دلی آ گئے تو کیفی صاحب اُن کے رفیقِ کار ہو گئے اور انجمن کے دفتر ہی میں رہنے لگے۔ مولوی صاحب اکثر دوروں پر رہتے تھے۔ اور کیفی صاحب ہی انجمن کے تمام کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے ایک اور پُرانے

qasarulkutub.blogspot.com

دوست اور رفیقِ کار ہاشمی فرید آبادی صاحب تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے آئے تھے اور یہاں انجمن کا دفتر قائم کرکے کام کرنے لگے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے آشوب میں انجمن بھی دھڑی دھڑی کرکے لُٹی۔ وہ تو خدا نے بڑی خیر کی کہ مولوی صاحب اُس وقت دِلّی میں نہیں تھے۔ ورنہ وہ ہرگز انجمن کو نہ چھوڑتے، اور انجمن کے چوکیدار اور اُس کے بیوی بچّوں کی طرح مولوی صاحب بھی قتل کر دیئے جاتے۔ کیفی صاحب کراچی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد دِلّی واپس چلے گئے تھے تاکہ انجمن کو وہاں سنبھال لیں۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا؟ لاکھوں روپوں کی کتابیں اور نایاب لائبریری کے پُرزے سارے دریا گنج میں اُڑتے پھر رہے تھے۔ بہر حال انجمن ترقّیِ اُردو برائے نام کیفی صاحب کے دَم کے ساتھ قائم رہی۔ کیفی صاحب کی عُمر نوّے سے اُوپر ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے بصارت زائل ہو رہی تھی، مگر اُردو کے لیے موت کو ٹالتے رہے۔ جب لال قلعہ کے دربارِ خاص میں جشنِ عالم ہُوا تو پنڈت جی کو تختِ شاہی پر بٹھایا گیا تو کیفی صاحب نے وہیں اپنے غم و غصّہ کا اظہار کیا اور ناراض ہو کر چلے آئے۔ زندگی کے باقی دن انھوں نے بڑی تکلیف میں بسر کیے۔ ایک دفعہ انھیں ان کی سالگرہ پر عقیدت مندوں نے ایک بڑی رقم کی تھیلی پیش کی تو انھوں نے وہ سارا روپیہ انجمن کو دے دیا۔ پنڈت کیفی نے ۹۶ سال کی عُمر پائی۔ اور آخر دم تک اُردو کے لیے لڑتے رہے۔ مولوی صاحب کو چھیڑنے کے لیے کیفی صاحب کہا کرتے تھے : "مسلمان کبھی اچھی اُردو لکھ ہی نہیں سکتا۔"

مولوی صاحب کو پاکستان آنے کے بعد چین نصیب نہیں ہُوا۔ یہاں عجب افراتفری تھی۔ جلد جلد حکومتیں بدل رہی تھیں۔ سب کو اپنی اپنی لگی ہوئی تھی، اُردو کو بھلا کون پوچھتا؟ اُردو کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک چل رہی تھی کہ اُردو پاکستان کے کسی خطّے کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے یہاں کی قومی زبان اُردو نہیں ہونی چاہیے۔ اُس نازک وقت میں اگر اہلِ پنجاب یہ کہہ کر سامنے نہ آجاتے کہ ہماری زبان اُردو ہے تو آج اُردو صرف مہاجروں کی زبان بن کر رہ جاتی۔ ادھر قائدِ اعظم نے اعلان کر دیا کہ "پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔" اس وقت تو مخالفین کا دَم رُک گیا مگر قائدِ اعظم پاکستان بننے کے ایک سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے اور اُردو کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ محمد علی بوگرا وزیرِ اعظم بن گئے اور اُنھوں نے اپنی خیر منانے

کے لیے دو قومی زبانوں کی تجویز پیش کی۔ اور تو کسی میں ہمّت کیا تھی کہ حکومت سے ٹکّر لے۔ مولوی صاحب ہی برہم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کی للکار پر لاکھوں فدائی اُن کے گرد جمع ہو گئے اور جس دن اسمبلی کے اجلاس میں بوگرا کی تجویز پیش ہونے والی تھی، مولوی صاحب اس ضعیفی اور کمزوری کے عالم میں انجمن کے دفتر سے پیدل روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ لاکھوں کا مجمع تھا۔ اسمبلی پہنچے تو ہمارے حکّام اور قانون ساز مولوی صاحب اور ان کے ساتھ اتنا بڑا مجمع دیکھ کر سٹ پٹا گئے۔ پولیس کے دستے لاٹھیاں لیے کھڑے تھے، اشک آور گیس کا بھی انتظام تھا، اور گولی چلانے والے دستوں کا بھی۔ مجمع اس قدر مشتعل تھا کہ اگر پولیس ذرا بھی حرکت میں آتی تو غدر مچ جاتا اور یہ آگ کراچی سے پھیل کر سارے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ بوگرا نے بڑی دانش مندی سے کام لیا کہ خود آکر مولوی صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے اور مولوی صاحب سے وعدہ کیا کہ قومی زبان کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا جائے گا۔ مولوی صاحب کو ناچار وہاں سے لوٹنا پڑا۔ مگر وہ حکومت کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے، نامطمئن واپس آئے اور جب جذبات میں ہیجان نہ رہا تو اعلان کر دیا گیا کہ پاکستان کی قومی زبانیں دو ہوں گی۔ اُردو اور بنگالی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے بہت کچھ کہا سُنا۔ مگر نقّار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔

مولوی صاحب نے جب انجمن کو جما لیا تو اسی عمارت کے ایک حصّے میں اُردو کالج بھی کھول دیا۔ اس کالج میں تمام مضامین اُردو میں پڑھائے جانے لگے۔ مولوی صاحب نے اس کالج کو وزارتِ تعلیم سے تسلیم کرا لیا۔ اور یہ بات منظور کر لی گئی کہ امتحان کے پرچوں کے جوابات اُردو میں دیے جا سکتے ہیں۔ اس کالج کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ اُردو کو اگر ذریعۂ تعلیم بنا لیا جائے تو انگریزی ذریعۂ تعلیم سے بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔ کالج کے کامیاب تجربے کے بعد مولوی صاحب کو اُردو یونی ورسٹی قائم کرنے کی لگن لگ گئی تھی۔ کراچی کا اگر ایک سرمایہ دار بھی ہمّت کر جاتا تو یونی ورسٹی بن جاتی۔ مگر ہمارے سرمایہ دار بھی حکومت کا رُخ دیکھ کر چلتے ہیں۔ حکومت اس تبدیلی کے خلاف تھی لہٰذا مولوی صاحب

qasarulkutub.blogspot.com

کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

اسی اثنا میں یہ ہُوا کہ مولوی صاحب کی صحت خراب رہنے لگی۔ جب مولوی صاحب نے نئے انتظام کے تحت انجمن کے کارکنوں کے اختیارات میں تبدیلی کی تو بعض پُرانے کارکن انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ نئے کارکنوں نے مولوی صاحب کو تو خوش رکھا مگر اندر ہی اندر انجمن کو مُوسنا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جب کسی پر اعتماد کر لیتے تھے تو پھر چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے، ان کا فیصلہ اٹل ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی طویل زندگی میں بارہا اس نوع کے اعتماد سے نقصان اٹھایا تھا مگر ان کی یہ کمزوری آخر وقت تک قائم رہی۔ جب انجمن کے انتظامی بورڈ نے دیکھا کہ انجمن کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے اور مولوی صاحب کھوکھلا کرنے والوں کو، مروّت میں بے گناہ سمجھے جا رہے ہیں، تو انھوں نے باہمی مشورہ کر کے انجمن کو اور انجمن کے کتب خانہ کو سیل کرا دیا۔ اس کارروائی سے مولوی صاحب کو سخت اذیت پہنچی اور انھوں نے ایک کتابچہ "انجمن کا المیہ" شائع کیا۔ یہ انجمن کے عروج و زوال کی ایک دردناک کہانی تھی جس میں مولوی صاحب نے انتظامی بورڈ کے ممبروں کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت انجمن کو سیل نہ کرا دیا جاتا تو جو کچھ بچ رہا تھا وہ بھی ٹھکانے لگ جاتا۔ مولوی صاحب کے معتمد کو مولوی صاحب کے پاس آنے جانے سے روک دیا گیا تھا تو مولوی صاحب اس مظلوم کے گھر خود جانے لگے تھے! اعتماد ہو تو ایسا ہو۔

یہ زمانہ مولوی صاحب کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔ انھوں نے اپنے پُرانے رفقائے کار کو ناراض کر کے چلتا کر دیا تھا اور نئے معتمد کے پیچھے اپنی ساکھ بھی گاڑ لی تھی۔ اُن کے ہمدردوں کو شبہ ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب کا دماغی توازن جاتا رہا ہے اور ایک صاحب نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مولوی صاحب کو ریٹائر ہو جانا چاہیے کیوں کہ وہ بہت بُوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر مولوی صاحب اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے اور مستعفی نہیں ہوئے۔ جب مارشل لا نافذ ہُوا اور صدر ایوب برسرِ اقتدار آئے تو مولوی صاحب نے اُن سے اپیل کی۔

صدر ایوب نے تمام باتوں کو نظر انداز کر کے انجمن اور لائبریری کو مولوی صاحب کے حوالے کر دینے کا حکم دے دیا تھا اس سے سُوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا اور مولوی صاحب کی اندھیری زندگی میں دوبارہ روشنی آ گئی۔

مولوی صاحب انجمن کے اتنے شدید عاشق تھے کہ انھوں نے کسی اور کو انجمن کے معاملات میں دخل دینے نہیں دیا۔ انھیں شاید یہ اندیشہ رہتا تھا کہ کوئی اور انجمن پر قابض ہو کر انھیں بے دخل نہ کر دے۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے سامنے ہی انجمن اور اُردو کا کام کرنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر جاتے جو اُن کے بعد دائرۃ المعارف اعظم گڑھ کی طرح بہت مفید علمی کام بھی کرتی رہتی اور شبلی کی طرح مولوی صاحب کے بھی بیسیوں نام لیوا اس وقت موجود ہوتے۔ انجمن کی موجودگی ہی میں ترقیٔ اُردو بورڈ کا قائم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انجمن ناکارہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے ۲۵-۳۰ سال پہلے اُردو کی ایک بہت بڑی اور جامع لُغت کا منصوبہ بنایا تھا اور حکومتِ حیدرآباد نے اس کام کے لیے کئی ہزار روپے سالانہ کی امداد بھی دینی شروع کر دی تھی۔ اس لُغت کا سارا کام مولوی صاحب نے مولوی احتشام الدّین حقّی دہلوی کو سونپ دیا تھا۔ یہ صاحب اٹھارہ گھنٹے روزانہ لغت کا کام کرتے تھے اور اسی محنت و جاں فشانی سے کہ پُورا ترقیٔ اُردو بورڈ مع اپنے وسیع وسائل کے نہیں کر رہا۔ حقّی صاحب کو مولوی صاحب پانچ سو روپے ماہانہ دیتے تھے۔ مگر حقّی صاحب پیسے کے لیے کام نہیں کرتے تھے، کام کے لیے کام کرتے تھے۔ اور جب وہ کام میں منہمک ہوتے تھے تو انھیں دین دُنیا کی خبر تک نہیں رہتی تھی۔ ان کی بیگم بار بار دروازے کے قریب آ کر کہتی تھیں "کھانا کھا لیجیے۔" اور حقّی صاحب "اچھا" کہتے اور بُھول جاتے۔ یہ تماشا میں نے حیدرآباد میں بھی دیکھا اور دِلّی میں بھی۔ دِلّی میں جب انجمن کی امداد کم ہُوئی تو مولوی صاحب نے حقّی صاحب کے پانچ سو کے بدلے ڈھائی سو روپے کر دیے تھے مگر حقّی صاحب کے کام کرنے کے انداز میں فرق نہ آیا۔ اب اُن کا بڑھاپا بھی آ گیا تھا اور صحت خراب رہنے لگی تھی مگر وہ دفتر سے چپکے رہتے تھے اور جب تک جاگتے رہتے تھے، کام کیے جاتے تھے۔ اور جب انجمن کی امداد بند ہو گئی تو مولوی صاحب نے حقّی صاحب سے کہہ دیا کہ کام بند کر دو تمھیں تنخواہ نہیں ملے گی۔ مگر حقّی صاحب عُمر بھر کی اس عادت

qasrulkutub.blogspot.com

کو کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ اور اب تو صرف آنکھوں کی شوٹیاں رہ گئی تھیں ۔ لہٰذا بے تنخواہ ہی کام کرتے رہے ۔ ادھر وہ اپنا کام ختم کر رہے تھے ادھر ان کی زندگی ختم ہو رہی تھی ۔ لُغت کے آخری حصّے کی نظرِثانی کر رہے تھے کہ اعصابی نظام نے جواب دے دیا ۔ چند روز ہسپتال میں رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ ان کے صاحب زادے شان الحق حقّی نے تمام مسوّدات مولوی صاحب کے حوالے کر دیے تھے ۔ پھر خبر نہیں وہ مسوّدات کہاں گئے ؎

آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد

مولوی صاحب بہت باقاعدہ عادتوں کے مالک تھے ۔ صبح کی چہل قدمی سے رات کی مشی تک اُن کا روزانہ ایک ہی سا پروگرام ہوتا تھا ۔ راتوں کو جاگتے نہیں تھے ۔ نیند پوری لیتے تھے اور صبح تازہ دم اُٹھتے تھے ۔ نوّے سے اُوپر ہو گئے تھے مگر صحت اچھی تھی ۔ ہمارا اندازہ تھا کہ سو پار کر جائیں گے ۔ مگر ابھی سو میں پانچ چھ سال باقی تھے کہ بیمار رہنے لگے ۔ مرض صحیح تشخیص نہیں ہوتا تھا ۔ خیال تھا کہ ہاضمہ کی شکایت ہو گی ۔ جو کراچی میں عام ہے ۔ مگر جب مرض بڑھ گیا تو ہسپتال میں داخل ہو گئے ، افاقہ نہیں ہُوا ۔

صدر ایوّب کو مولوی صاحب کی علالت کی اطلاع ہُوئی تو انھوں نے پنڈی بُلوا کر سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کرا دیا ۔ وہاں مولوی صاحب کا مرض کینسر تشخیص ہُوا ۔ لاعلاج مرض کا علاج ہی کیا ؟ جب زندگی سے مایوسی ہو گئی تو مولوی صاحب کو کراچی کے جنرل ہسپتال میں بھیج دیا گیا ۔ یہاں پہنچے تو مرض اتنا بڑھ چکا تھا کہ مولوی صاحب اکثر بے ہوش رہنے لگے ۔ جب انھیں ہوش آتا تھا تو کچھ بولنا چاہتے تھے مگر نقاہت اتنی تھی کہ سرگوشی سُنائی نہیں دیتی تھی ۔ صرف دو لفظ کبھی کبھی قریب رہنے والوں نے سُنے :

" انجمن اور اُردو "

(۱۹۶۴ء)

مولانا عبدُالسّلام نیازی

مولانا اپنی وضع قطع سے ریٹائرڈ پہلوان معلوم ہوتے تھے ۔ مَیں نے انھیں اب سے چالیس سال پہلے قاضی کے حوض پر ایک گندھی کی دکان پر بیٹھے دیکھا تھا ۔ یہ گندھی صاحب بھی کچھ اس گت کے آدمی تھے کہ جو بھی ادھر سے گزرتا اس کی نظر خواہ مخواہ اُن پر پڑتی تھی ۔ جیم شحیم گوشت کا ایک کالا پہاڑ دکان کے تھڑے پر دھرا دکھائی دیتا تھا ۔ رنگ سیاہ ، سر خوب گھٹا ہُوا ، کالی گول داڑھی ، سفید سفید آنکھیں ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے تمباکو کے پنڈے میں کوڑیاں جڑی ہُوئی ہوں ۔ کُرتا پاجامہ اُجلا بُراق پہنتے تھے ۔ یوں ان کا کالا رنگ اور بھی چمک اٹھتا تھا ۔ سامنے تیل کے کنستر چنے رہتے تھے ۔ مولانا کا رنگ میدہ و شہاب تھا ۔ سر گھٹا ہُوا ، اُس پر چُنی ہُوئی دو پلّی ، گول چہرہ ، کشادہ پیشانی ، جگر جگر کرتی آنکھیں ، کتارا سی ناک ، موزوں دہن ، پتلے پتلے ہونٹ ، ان پر پان کی سُرخی جو پھیل کر باچھوں میں آگئی تھی ، داڑھی مونچھ صاف ، جیسے مُعدرا کرا دیا ہو ، گلے میں باریک مَلمل کا کُرتا ، آڑا پاجامہ نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہُوئیں ۔ پاؤں میں سلیم شاہی ، کندھے پر شالی رومال ، وضع قلندرانہ ، مزاج شاہانہ ۔ اس وقت جوانی سے گزر کر ادھیڑ عمر میں قدم رکھ چکے تھے ۔ حوضِ قاضی کی دکان پر گندھی صاحب کے پہلو بہ پہلو بیٹھے دکھائی دیتے تھے ——— ایک صاحب نے رات کا اندھیرا منھ پر مَل رکھا تھا ، دوسرے صاحب نے دن کا اُجالا ۔ عجیب اجتماعِ ضدّین تھا ۔ یوں اور بھی نظریں ان کی طرف کھنچی تھیں ۔ حرج نہیں ، برسوں یہ دن رات کا تماشا ہم دیکھا کیے ۔

مولانا کے علم و فضل کی تعریفیں غائبانہ بہت سُنیں ، تو انھیں دیکھنے کا اشتیاق ہُوا ۔ اور ایک دن سترھویں میں انھیں خواجہ حسن نظامی کے پکھوے سے لگے دیکھا تو مَیں نے اپنے ساتھی سے پوچھا

qasrulkutub.blogspot.com

کہ "یہ کون صاحب ہیں؟" انھوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ بولے۔ "آپ انھیں نہیں جانتے؟" میں نے کہا۔ "دیکھا تو اکثر ہے مگر....؟" وہ بولے "ارے صاحب! یہ مولانا عبدالسلام صاحب نیازی ہیں۔" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، اور میں نے جو بے شمار روائتیں ان کے بارے میں سُن رکھی تھیں، سب میرے تخیل میں ہجوم کر آئیں۔

اس واقعے کے بعد کوئی پچیس سال تک میں مولانا کو دیکھتا رہا، اور کبھی کبھی ان کی مختصر گفتگو سننے کا مجھے اتفاق ہُوا۔ مگر مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں نے کبھی ان سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرے لیے وہ ہمیشہ دُور کا جلوہ ہی رہے۔ میں پاکستان چلا آیا تو وہ آنکھوں سے بھی دُور ہو گئے۔ اور اب تو وہ بہت دُور ہو گئے۔ اتنی دُور کہ اب آنکھیں انھیں کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

مولانا نے ساری دُنیا کا علم چاٹ رکھا تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو کے منتہی تھے۔ مذہبی علم، معقول و منقول، دونوں ان کے پاس اتنا تھا کہ سوائے مولوی ایّوب کے کوئی اور ان کے آگے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہر علم سے خدا کا وجود ثابت کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ علمِ موسیقی سے بھی۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ ہر کتاب انھیں ازبر تھی۔ یہاں تک کہ بعض کتابوں کے صفحے تک بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر دیکھو، یہ عبارت ملے گی۔ مزاج میں درشتی بہت تھی، اس لیے اپنی شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے۔ مگر جس کو انھوں نے پڑھا دیا وہ پارس بن گیا۔ شاگرد سے اگر ناراض ہوتے تھے تو اسے سخت سے سخت سزا دیتے تھے۔ مثلاً اُسے ستون سے باندھ دیتے اور زیادہ غصہ آتا تو اسے بید سے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ علم کا ایک سمندر تھا کہ ان کے دماغ میں موجیں مارتا رہتا تھا۔ چاہتے تھے کہ شاگرد بھی انھی جیسا ہو جائے۔ جب یہ توقع پوری نہ ہوتی تو جھنجھلاتے اور شاگرد کی شامت آ جاتی۔

مولانا کی گفتگو بڑی نستعلیق ہوتی تھی۔ کبھی علمی لہر آ جاتی تو ادق استعاروں میں بولنے لگتے۔ مثلاً ایک دفعہ رنڈی کے متعلق فرمایا کہ "اس مثلثِ لحمی کو تو عمودِ ذہب چاہیے۔" اور کبھی ٹکسالی لہر آ جاتی تو سہلِ ممتنع پیرایۂ بیان اختیار کرتے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کی کافرانہ باتیں سُن کر فرمایا کہ "تمھارا دماغ تو شیطان کی کھڈی ہے۔" کبھی درگا کا گانا سنتے تو اُس کے گانے کی تعریف

بھی کرتے اور اس کی اُنگلیوں کی بھی۔ فرماتے تھے کہ تمھاری اُنگلیاں کیا ہیں ہری مرچیں ہیں۔ نظامِ دکن میر عثمان علی خاں ایک زمانے میں دُنیا کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی تھے۔ مولانا کے ایک بہی خواہ نے مولانا سے کہا کہ "آپ اگر نظام کو ایک درخواست لکھ دیں تو آپ کا وظیفہ مقرر ہو جائے گا۔" مولانا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ غصّے سے بولے۔ "نظام کی ساری دولت ایک پلڑے میں اور میرا ایک بوسیدہ سے بوسیدہ بال دُوسرے پلڑے میں رکھ دو تو میرا بال ہی بھاری اُترے گا۔"

مولانا کا بظاہر کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا۔ معلّمی کا وہ کچھ نہیں لیتے تھے۔ لوگوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ مولانا تیل بنا کر بیچتے ہیں۔ ننّو تیلی سے ان کا دوستانہ ہے۔ اُس کے لڑکے کو بھی مولانا نے پڑھایا تھا۔ قاضی کے حوض پر جس گندھی کی دکان تھی، اُس سے بھی اُن کا دوستانہ تھا۔ بس یہی دو تیلی تھے جن سے مولانا خرید فروخت کرتے تھے، مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کیسا تیل خریدتے تھے، کتنا خریدتے تھے، اُسے بناتے کس طرح تھے، کس وقت بناتے تھے اور کب بیچتے تھے۔ مولانا کے خرچ بڑے اُجلے تھے اور ان کا ہاتھ بھی کھُلا ہُوا تھا۔ تیل سے ایسی کیا بچت ہو جاتی ہو گی؟ ہم تو کہتے تھے "میاں تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔" ایک صاحب کہتے تھے کہ مولانا کو تیل کا نسخہ ایک موکّل نے بتایا تھا، اس لیے ان کا تیل خُوب بِکتا تھا، کیوں کہ کسی اور کو تو یہ تیل بنانا آتا نہیں تھا۔ دِلّی والوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ مولانا کو دستِ غیب ہے۔ ان کی جیبوں میں ہر وقت نوٹ بھرے رہتے تھے۔

مولانا کو گانا سُننے کا شوق تھا۔ نعتیں اور غزلیں سُنتے تھے۔ سوئی والوں میں گانے بجانے والوں کا ایک خاندان شاہی زمانے سے رہتا تھا۔ اسی خاندان کا ایک لڑکا، جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں، کسی عُرس میں مولانا کی نظر پڑ گیا۔ مولانا حُسن پرست بھی تھے۔ حُسنِ مجازی میں اُنھیں حُسنِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ کیوں نہ ہو، صوفی صافی تھے۔ ہر اچھی شکل میں جلوہ دیکھ لیتے تھے۔ عثمان کا شمار حسینوں میں نہیں تھا۔ ہاں سانولا سلونا لڑکا تھا۔ مولانا نے اُسے اپنے کمرے میں بُلانا شروع کر دیا۔ اس سے دو چار چیزیں سنتے اور پانچ روپے دے کر رخصت کر دیتے۔ عثمان کے ساتھ اُس کا جوڑی دار رمضان بھی جایا کرتا تھا۔ اس کا رنگ کھِلا ہُوا تھا، عمر میں عثمان سے ایک آدھ سال بڑا تھا۔ اُسے پکّے گانے کا شوق تھا مگر غزل گانے میں عثمان کو سہارا

qasrulkutub.blogspot.com

دیا کرتا تھا۔ مولانا نے اس جوڑی کو اپنے ڈھب سے خوب سدھا لیا تھا۔ انھیں فارسی اور اُردو کا متصوفانہ اور عاشقانہ کلام یاد کرا دیا تھا۔ مولانا ان دونوں کو اپنے کمرے میں بھی سُنتے اور اپنے ساتھ دِلّی اور دُوسرے شہروں کے عرسوں میں بھی لے جاتے۔ جب یہ دونوں گاتے تو مولانا کے ساتھ محفل بھی جھوم جاتی۔ اِدھر مولانا نے دو چار روپے دیے اُدھر روپے کا مینہ برس جاتا۔ دونوں لڑکے جھولیاں بھر بھر کر گھر لاتے۔ حاسدوں نے مولانا کے متعلق طرح طرح کی ہوائیاں اڑانی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں عثمانؔ کے گھر والوں تک بھی پہنچیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے اور آپس میں مشورے ہوئے کہ اس بدنامی سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟ کسی نے کہا "عثمانؔ کو مولانا کے ہاں جانے سے روک دیا جائے۔" مگر اس صورت میں جو موٹی آمدنی ہو رہی تھی، وہ بھی ماری جاتی۔ زبانِ خلق نے خاندان والوں کو مولانا کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ آبرو ہے تو سب کچھ ہے۔" لہٰذا عثمانؔ کو روک لیا گیا۔ مولانا کے ہاں سے طلبی ہوتی تو اڑان گھائیاں بتا دی جاتیں۔ جب مولانا کی طرف سے اصرار بڑھا تو خاندان کے دو چار بزرگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مولانا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ "دُنیا کچھ ہی کہا کرے، پرستم قلندر۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ عثمانؔ کا بدن میرے لیے ایسا ہے جیسے میری ماں کا بدن۔" عثمانؔ کے بڑے بوڑھوں کا اطمینان ہو گیا اور عثمانؔ کا آنا جانا پھر کھل گیا۔

مولانا قوالی بھی سُنتے تھے اور ان پر کیف بھی طاری ہوتا تھا، مگر حال کھیلنے یا دُوسرے صوفیوں کی طرح رقص کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ جو شعر پسند آ جاتا تھا اس کی تکرار کراتے تھے۔ خوب جھومتے تھے اور قوالوں کو روپیہ بھی خوب دیتے تھے۔ خسروؔ کی نعت "نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم" بہت پسند تھی۔ مقطع کی تکرار ضرور کراتے تھے۔

عرسوں میں رنڈیوں کا گانا بھی سُنتے تھے اور لُطف اندوز ہو کر روپیہ بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھی شدّتِ کیف میں طوائف میں انھیں جلوہ دکھائی دے جاتا تو طوائف کو پاس بُلا کے اُس کا بوسہ لے لیتے۔ یہ گویا مولانا کی طرف سے انتہائی قدردانی ہوتی تھی۔ طوائفیں بھی اس عمل کو اپنے

لیے باعثِ فخر سمجھتیں۔

مولانا بڑے خوش مزاج اور فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ایک عُرس میں بہت سارے مشائخ اور صُوفی جمع تھے کہ ایک حسین طوائف اپنا گانا سُنانے آ بیٹھی۔ ایک صُوفی صاحب نے اسے دیکھ کر "جل جلالہٗ" کا نعرہ لگایا۔ اتنے ہی میں اس کی نائکہ بھی آ دھمکی۔ مولانا نے صُوفی صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا، "لیجیے "عمّ نوالہٗ" بھی تشریف لے آئی ہیں۔" ایک قہقہہ پڑا اور موصوف پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

دیواڑی میں مولانا ایک گانے کی محفل میں شریک ہوئے۔ ایک پڑھی لکھی طوائف گا رہی تھی۔ مولانا نے اس سے فرمائش کی کہ تمھیں زیادہ سے زیادہ اشعار کی جو غزل یاد ہو، سُناؤ۔ اُس نے کہا۔ "حضور، غزل تو نہیں، ہاں ایک خمسہ یاد ہے۔" فرمایا۔ "سُناؤ۔" اس نے چالیس بند کا ایک خمسہ سُنایا۔ جب اس نے گانا ختم کیا تو مولانا نے تعریف کی اور فرمایا۔ "جو چیز مجھے پسند آ جاتی ہے میرے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر پُورا خمسہ اُسی ترتیب سے سُنا دیا۔

اب سے چالیس سال پہلے دِلّی میں ایک لال بیگی تھا۔ نام اُس کا صنمؔ تھا۔ اُس کی دو لڑکیاں تھیں جنھیں اُس نے گانے بجانے پر لگا دیا تھا۔ مگر یہ دونوں بہنیں کہلاتی "جھنگنیں" ہی تھیں۔ صُورت شکل کی بھی بُری نہیں تھیں۔ سفید دوپٹہ، سفید کُرتا اور سفید ڈھیلا پاجامہ۔ شریف بہو بیٹیوں کی سی وضع قطع۔ ایک بہن ڈھولک بجاتی تھی، دُوسری ہارمونیم۔ اور دونوں مل کر گاتی تھیں۔ [illegible] قافیہ درست۔ کلام اچھا یاد تھا۔ گھمبیری آوازیں۔ سماں باندھ دیتی تھیں۔ خود شائستہ تھیں اس لیے محفل بھی شائستہ ہوتی تھی۔ مولانا ان کا گانا بڑے شوق سے سُنتے تھے۔ ایک دن رات کے دو بجے خُدا جانے مولانا کو کیوں یاد آ گئیں۔ اُسی وقت حکیم علی رضا خاں کے گھر پہنچے۔ انھیں جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آئے۔ "خیر تو ہے مولانا؟" بولے۔ "انھیں بلواؤ۔ ان کا گانا سُنیں گے۔" بھلا مولانا کا کہنا ٹل سکتا تھا۔ اُسی وقت آدمی گیا اور انھیں بُلوا لایا۔ حکیم صاحب کی بیٹھک میں گھنٹہ دو گھنٹے گانا سُنا اور انھیں کچھ دے دلا کر رُخصت کیا۔

اُسی زمانے میں جاورہ کا بخشو قوال دِلّی میں آیا اور خواجہ حسن نظامی کے ایک مُرید شیخ یعقوب ٹھیکیدار کے ہاں رہنے لگا تھا۔ بخشا چھریرے بدن کا نازک سا نوجوان تھا۔ اچکن اور آڑے

qasrulkutub.blogspot.com

پاجامے میں بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی انوٹ سے بول بناتا تھا۔ اور لے کی تراش خراش اچھی کرتا تھا۔ اس کا گنتیا جھمن خاں بھی تھا۔ وہ بھی اسی کا متنتی تھا۔ ڈھولک بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بخشا جب پہلی مرتبہ ستر صوبیں میں خواجہ صاحب کی محفلِ خاص میں گایا تو ساری دلی میں اس کی شہرت ہوگئی۔ مولانا بخشا پر فدا ہو گئے تھے اور اکثر اس کی قوالی سنتے تھے۔ بخشا بھی بڑی عقیدت سے انھیں اپنا گانا سناتا تھا۔ جب اور جہاں یاد فرماتے، فوراً حاضر ہو جاتا۔ افسوس کہ بخشا جوان ہی مر گیا۔ جھمن خاں اب بھی زندہ ہیں مگر بخشا کے بعد سے زندہ درگور ہیں۔

ایک محفلِ خاص میں مولانا نے عثمان خاں کو گانے پر بٹھا دیا اور ایک فارسی غزل کی فرمائش کر دی۔ مولانا اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک صوفی نے کسی شعر کو غلط بتا دیا۔ مولانا کو تاؤ آگیا۔ بولے "نہیں، صحیح گا رہا ہے۔" خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے۔ انھوں نے صوفی کی طرف داری کی۔ مولانا بھڑک اٹھے۔ بولے۔ "شیخ، اگر کچھ سمجھتے ہو تو اس کی تشریح کرو۔" سب خاموش رہے تو مولانا کا جوالا مکھی پھٹا اور دو گھنٹے تک عالمِ لاہوت اور ناسوت کا لاوا بہتا رہا۔

مولانا کی طلاقتِ لسانی اور خوش بیانی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ رُوح کی ماہیت پر جو صبح سے بولنا شروع کیا تو سارا دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ صبح چار بجے تک لیکچر جاری رہا، اور ناتمام رہا۔

مولانا کی آمدنی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کوئی ذریعہ اس کا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے پاس حاجت مند بھی آتے تھے اور کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔ حاجت مند کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ ایک دفعہ چار آدمی اجمیر شریف کے عرس سے لوٹ رہے تھے کہ ان کا سارا روپیہ ختم ہو گیا۔ مولانا سے ملنے گئے تو مولانا نے اپنے ایک شاگرد کو آواز دی کہ "دیکھو، چھینکے پر کچھ نوٹ رکھے ہیں، وہ اتار لاؤ۔" دو سو کے نوٹ تھے جو انھوں نے ان حضرات کو پیش کر دیے۔

حیدرآباد دکن سے ایک نواب صاحب دلی آئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے پوچھا، "کیسے آنا ہوا؟" نواب صاحب نے کہا۔ "سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

مولانا کو جلال آگیا۔ فرمایا۔ "کیوں بلایا ہے اس نے ہمیں؟ اگر وہ اپنے علم سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کے رعب میں آنے والے نہیں۔ اور اگر وہ ہمیں اپنی دولت دینا چاہتا ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ارے عثمان! دیکھو، وہ سامنے مچان پر جو بوری رکھی ہے، اٹھا لاؤ۔" عثمان جا کر بوری اٹھا لایا۔ مولانا نے فرمایا۔ "اس میں جو کچھ ہے باہر نکال۔" عثمان نے بوری میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو نوٹوں کی گڈی نکلی۔ عثمان نے وہ گڈی فرش پہ رکھ دی۔ مولانا نے ڈپٹ کر کہا۔ "اور نکال۔" عثمان نے پھر ہاتھ ڈالا اور ایک گڈی نکال کر رکھ دی۔ غرض یوں ہی سو سو اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکالتا رہا اور گڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مولانا نے نواب صاحب سے کہا۔ "اور دیکھیے گا؟" نواب صاحب تھرا گئے۔ ہکلا کر بولے۔ "حضور کے پاس کیا کمی ہے۔" مولانا نے فرمایا۔ "جا، اپنے نظام سے کہہ دے، ہم کسی کے پاس نہیں جایا کرتے۔" نواب صاحب ہاتھ جوڑتے اور سلام جھکاتے وہاں سے رخصت ہوئے۔ مولانا نے عثمان سے کہا۔ "انھیں بوری میں بھر کے وہیں رکھ آ۔" عثمان نے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹیں اور بوری پھر مچان پر رکھ دی۔ رمضان کے دل میں بدی آئی۔ عثمان سے کہا۔ "ابے دو ایک گڈیاں تو پار کر دے۔" عثمان نے ہنس کر کہا۔ "بوری میں کیا رکھا ہے؟ بوری تو خالی ہے۔" استاد رمضان خاں زندہ سلامت ہیں اور کراچی میں موجود ہیں۔ انھوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنا بچشم دید واقعہ سنایا۔

مولانا کو ایک زمانے میں شعر و شاعری کا بھی شوق ہوا تھا۔ داغ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ استاد سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب کسی سے استاد کا شعر سنتے تو "سبحان اللہ" کہہ کر فوراً سجدہ کر لیتے۔

سجدہ کرنے پر یاد آیا کہ مولانا کا عالمِ شباب تھا کہ دلی کے ایک معروف حکیم کی داشتہ دھنّو پر مولانا عاشق ہو گئے۔ چرخے والوں میں پہلا نمبر جگمگی طوائف کا تھا، اور دوسرا دھنّو کا۔ مولانا کا عشق دنیا زمانے سے نرالا تھا۔ ہر روز رات کو ایک مقررہ وقت پر دھنّو کے بالاخانے پر جاتے۔ دروازہ تھپتھپاتے۔ دھنّو دروازہ کھولتی تو اس کے ہاتھوں میں سلگتی ہوئی اگربتیوں کا مٹھا ہوتا۔ وہ دھونی دیتی، مولانا آستانِ محبوب پر سجدے کرتے اور چلے جاتے۔ ان کا یہ معمول عرصۂ دراز تک رہا۔ ؏ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

qasrulkutub.blogspot.com

مولانا داڑھی مونچھ کا صفایا کرتے تھے۔ دِلّی کے ایک بہت نامور عالمِ دین گزرے ہیں مولوی کرامت اللہ۔ بڑے پابندِ شرع اور نیک بزرگ تھے۔ اُن کے بے شمار مُرید بھی تھے۔ ایک دفعہ اپنے وعظ میں انھوں نے ڈاڑھی کی فضیلت بیان کی اور ڈاڑھی نہ رکھنے کی فضیحت۔ مولانا کو اس کی خبر پہنچی تو بُرا مان گئے۔ ایک دن ساری رات قوالی سننے کے بعد صبح ہوتے گھر آ رہے تھے کہ راستے میں کرامت اللہ صاحب کا گھر پڑ گیا۔ مولانا مع اپنے حواریوں کے وہیں رُک گئے۔ کنڈی بجائی، مولوی صاحب خود برآمد ہوئے۔ مولانا کو نا وقت دیکھ کر حیران ہوئے مگر فوراً تعظیماً مصافحہ کیا اور فرمایا۔ "بسم اللہ، اندر تشریف لائیے۔" اپنے کمرے میں لے جا کر عزت سے بٹھایا پوچھا۔ "کیسے قدم رنجہ فرمایا؟" مولانا نے کہا۔ "شیخ! ہم نے سوچا آج تم سے ڈاڑھی پر گفتگو ہو ہی جائے۔" اور اس کے بعد مولانا کے علم کے سمندر میں جوار بھاٹا آگیا۔ خدا جانے مولوی صاحب نے مولانا کو کیسے رام کیا کہ آخر میں ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔

عجیب ہے کہ مولانا نے کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی اور نہ کسی کو اپنے پیچھے پڑھنے دی۔ ایک دفعہ صابر صاحب کے ہاں حاضرین نے انھیں زبردستی گونجہ کا نتھ کے نماز پڑھانے کھڑا کر ہی دیا۔ خیر نہیں مولانا کے جی میں کیا آئی کہ رضامند ہوگئے۔ پہلی رکعت میں جب سجدے میں گئے تو سب کو چھوڑ کر چلتے بنے۔

مولانا نقد دم تھے۔ ان کا کوئی عزیز اقارب کبھی نہ دیکھا نہ سُنا۔ بس جو کچھ تھا ننو آتیلی تھا۔ یا اُس کے بچے۔ ترکمان دروازے تیلیوں کے پھاٹک کے سامنے مولانا کا بالاخانہ تھا، جس میں وہ اکیلے رہتے تھے۔ ننو آتیلی کے بڑے بیٹے کے اُستاد تھے اور ننو آتیلی کی لڑکی کو بیٹی بنا لیا تھا یہی مُنھ بولی بیٹی کھانا پکا کر انھیں کمرے میں بھیجتی تھی۔ اس کی شادی مولانا نے خاصی دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی کے تمام اخراجات خود اٹھائے تھے۔ اپنے تیل کا نسخہ بھی اس کے جہیز میں دے دیا تھا۔ اس تیل سے ان کے داماد نے خوب کمائی کی۔

مشہور یہ تھا کہ مولانا نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جوانی میں شادی کی تھی۔ اس سے اولاد نہیں ہوئی۔ مولانا قوالیوں کے چکر میں رہتے تھے۔ راتیں انھی میں گزرتی تھیں مگر صبح ہونے سے پہلے گھر ضرور آجایا کرتے تھے۔ بیوی اکیلی پڑی تارے یا کڑیاں گنا

کرتی تھی۔ آخر تنگ آکر اُس نے روک ٹوک شروع کیا۔ مولانا ایک آزاد مزاج آدمی تھے۔ وہ بھلا پابندیوں کو کیسے گوارا کر لیتے؟ ایک دن بیوی کو طلاق دے دی اور عدّت پوری ہونے کے بعد ننو آتیلی کے بیٹے عبدالحی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

خواجہ حسن نظامی سے مولانا بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی اُن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب نے مولانا سے فرمائش کی کہ آپ تصوّف پر ایک کتاب لکھ دیجیے۔ مولانا کچھ موج میں تھے، رضامند ہو گئے۔ ورنہ مولانا زبان کے جتنے طرّار تھے، قلم کے اتنے ہی پھسڈّی تھے۔ مہینے دو مہینے میں کتاب لکھ لی۔ اور مسوّدہ لے کر خواجہ صاحب کے ہاں پہنچے۔ خواجہ صاحب نے کتاب کو اِدھر اُدھر سے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ بہت تعریف کی اور بولے۔ "معاوضہ جو آپ فرمائیں پیش کر دیا جائے۔" مولانا نے کہا۔ "معاوضہ کیسا؟ شیخ، ہم نے تو تمھاری فرمائش پر کتاب لکھی ہے۔" خواجہ صاحب نے کہا۔ "بہت اچھا۔ مگر کتاب میرے نام سے چھپے گی۔" یہ سُننا تھا کہ مولانا کا ناریل چٹخا۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اُس کے چار ٹکڑے کر ڈالے اور بولے۔ "خدا خوش رکھے شیخ لاؤ چائے پلواؤ۔" خواجہ صاحب نے متاسف ہو کر کہا۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟" مولانا نے کہا۔ "کچھ نہیں شیخ تم چائے پلواؤ۔" مولانا کی آنکھ پر میل نہیں تھا۔ چائے پی اور ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے پھر کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

ایک بار مولانا سے ایک صاحب ملنے گئے جو اپنے آپ کو ادیب اور نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھتے تھے۔ مولانا نے پوچھا۔ "فارسی جانتے ہو؟" انھوں نے جواب دیا۔ "نہیں۔" "عربی جانتے ہو؟" انھوں نے پھر وہی جواب دیا۔ "نہیں۔" "علم معقول و منقول؟" ظاہر ہے کہ اس کا جواب بھی نہیں ہی تھا۔ اس پر مولانا نے کہا۔ "میاں تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمّی ہوں۔" واقعی مولانا علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ وہ جسے بھی چاہتے یہ فقرہ کہہ سکتے تھے۔

مولانا بڑے نڈر آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دِلّی میں فسادات ہوئے تو ہندو اکثریت کے محلّوں میں سے مُسلمان نکل کر مُسلمانوں کے محلّوں میں آنے لگے تھے۔ مگر مولانا تن تنہا اپنے کمرے ہی پر ڈٹے رہے۔ لوگوں نے انھیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ اُن کی مُنھ بولی بیٹی اور داماد بھی

qasatulkutub.blogspot.com

پاکستان چلے گئے مگر مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پاکستان جانے والوں سے مولانا بہت ناراض ہوتے تھے۔ چناں چہ بیٹی اور داماد سے بھی ناراض ہو گئے۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور شرنارتھیوں کی کھیپ پر کھیپ دِلّی آنے لگی۔ یہ آنے والے دِلّی میں خالی گھر ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ڈرا دھمکا کر بھی مسلمانوں سے گھر خالی کرا لیتے تھے۔ مقفّل گھروں کے تالے توڑ کر گھس جاتے تھے۔ انھی میں سے کسی کو معلوم ہوا کہ اس بالا خانے پر ایک بُڈّھا مسلمان اکیلا رہتا ہے۔ اس نے موقعے کو غنیمت جانا اور تلوار لے کر زینے پر چڑھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سنّاٹا تھا۔ بے روک ٹوک صحن میں پہنچ گیا۔ مولانا نے جو اُسے دیکھا تو ڈانٹ کر کہا۔ "کون ہے تو؟" وہ کچھ ایسا سٹپٹایا کہ تلوار وہیں پھینک کر بھاگ گیا۔ مولانا نے تلوار اٹھا کر اُس کے پیچھے زینے میں پھینک دی۔

ایک دفعہ اور مولانا پر حملہ ہوا۔ اب کے چار سِکھ اپنی کرپانیں لیے اوپر چڑھ آئے مگر مولانا کو دیکھ کر اُن پر ہیبت چھا گئی۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ مولانا کی عمر اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی۔ کم سجھائی دینے لگا تھا۔ مگر وہ سمجھ گئے کہ یہ چاروں قتل کرنے آئے ہیں۔ بڑے اطمینان سے بولے۔ "آپ جس قصد سے آئے ہیں اسے جلد پورا کیجیے۔" قاتلوں نے خبر نہیں کیا دیکھا کہ ان کی گھگھی بندھ گئی۔ ایک نے بڑی ہمّت کر کے کہا۔ "جی ہم تو آپ کے درشن کرنے آئے تھے۔" مولانا نے پھر کہا۔ "نہیں نہیں، آپ جس کام کے لیے آئے ہیں اسے جلد انجام دیجیے۔ اس میں دیر نہ کیجیے۔" انھوں نے کہا۔ "جی ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔" مولانا نے فرمایا۔ "اچھا تو چلے جاؤ۔" اور وہ چاروں وہاں سے گدا گد گدا گد زینے پر سے ایسے گھبرا کر بھاگے جیسے خود ان کی جان خطرے میں ہو۔ سچ ہے، "جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے؟"

مولانا آخر دم تک اپنے بالا خانے ہی پر رہے اور چند مہینے ہوئے کہ اپنی طبعی موت مرے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

۱۹۶۷ء

شوکت تھانوی

خدا بخشے شوکت تھانوی ان لوگوں میں سے تھے جو روتوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی تھی۔ عجیب زعفران زار شخصیت تھی مرحوم کی۔ چلبلے آدمی تھے، نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اُن کی رگوں میں خون کے بدلے پارہ دوڑتا تھا۔ تُرت پھُرت، یہ آئے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلاوہ تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اب بھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ بھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دِلی ہو وہ کیسے مر سکتا ہے؟ مگر یقین کرو یا نہ کرو شوکت واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو روتا چھوڑ گیا۔ بس اُس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ "دیکھ لینا یہ شخص ایک نہ ایک دن ایسا دھوکا دے گا کہ بلبلاتے ہی رہ جاؤ گے۔" دیکھ لیا نا؟ بتیس سال کے تعلقات کا اتنا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیلا ہی سدھار گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلنا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرنے میں بھی جلدی۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اُس وقت سنا جب ۳۵ سال اُدھر کسی نے بتایا کہ "نیرنگِ خیال" کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون "سودیشی ریل" پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔ رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھڑک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آ جاتا ہے تو ہنسی آ جاتی ہے۔ جب اس مضمون کی شہرت عام ہوئی تو کسی حاسد نے پتا چلایا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا، یہ مضمون اُس کا ترجمہ ہے۔ ہمیں بھی اس کی ٹوہ لگ گئی۔ اصل

darsaulkutub.blogspot.com

مضمون کا ترجمہ کیا، نہ ترجمہ نہ چربہ، ان دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرکزی تصور اس مختصر سے خاکے سے لیا گیا تھا۔ شوکت تھانوی نے اس تصور کو اپنے رنگ میں اس خوبی سے پیش کیا تھا کہ یہ سولہ آنے (یا سو پیسے؟) انھی کی تخلیق ہوگئی تھی۔ اور یہ جو خوردہ گیری ہی ہو تو شیکسپیئر کا کون سا ڈراما طبع زاد کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا؟ یونہی چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے اور یہ ڈاکہ زنی کہ غاصب ہی ہوتا ہے۔

اس مضمون کے لکھنے سے پہلے بھی شوکت تھانوی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ پہلے لکھنؤ کے ایک اُردو اخبار میں کالم لکھتے تھے، پھر دو اخباروں میں لکھنے لگے تھے۔ میر جالب دہلوی کے "ہمدم" میں اُن کے ادبی ذوق نے تربیت پائی۔ ان کے والد ایک بڑے پولیس افسر تھے۔ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوکت آسانی کے ساتھ سب انسپکٹر پولیس بن سکتے تھے۔ مگر جو شعر و ادب کے چکر میں پڑ جاتے ہیں وہ پھر کسی اور کام کے کب رہ جاتے ہیں۔ بچپن باپ کے ساتھ کم اور بڑی بہن کے ساتھ زیادہ گزرا۔ یہ بڑی بہن خود بھی ادبی ذوق رکھتی ہیں اور یہ خاتون وہ ہیں جن کے شوہر نامدار مولانا ارشد تھانوی ہیں جو شوکت تھانوی کے چچا زاد بھائی بھی ہیں۔ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ! ان کے سایۂ عاطفت نے شوکت کو شاعر، ادیب اور تھانوی سبھی کچھ بنا کر چھوڑا۔ ورنہ تھانہ بھون سے شوکت کا کیا تعلق؟ پیدا بنارس میں ہوئے، پلے بڑھے بھوپال اور لکھنؤ میں۔ اصلی نام تھا محمد عمر، تخلص شوکت اختیار کیا اور اپنے بزرگ بھائی کی دیکھا دیکھی تھانوی کا لاحقہ اس میں ٹانک لیا۔ اسی لاحقہ کی وجہ سے پطرس کہا کرتے تھے کہ "خدا جانے کس تھانہ سے ان کا تعلق ہے؟" بڑوں کی بھول چوک پر پردہ ڈال دینا عین سعادت مندی ہے۔ محمد عمر کو اب کوئی نہیں جانتا شوکت تھانوی کو سب جانتے ہیں ؏

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

۱۹۳۲ء کے اوائل میں ایک دن صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ دو صاحب ملنے آئے ہیں۔ نام پوچھے تو نام نہیں بتائے۔ ان کی یہ بداخلاقی طبیعت کو ناگوار گزری۔ میں نے کہا، مردانہ گھر کی بیٹھک میں انھیں بٹھاؤ۔ میں اُسی وقت اُٹھا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ انھیں اتنے سویرے

آنے اور نام نہ بتانے کی سزا دینی چاہیے۔ چناں چہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور آدھ گھنٹے بعد مردانے میں آیا۔ دونوں انتظار میں سوکھ گئے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ سرو قد کھڑے ہوگئے۔ یہ دونوں جوان تھے، جنھیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آگئے۔ دونوں چھیلا بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ بیباک تھے، ذرا آگے بڑھ کر بولے۔

"ہمیں پہچانیے؟"

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی، کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، شریر بے قرار آنکھیں، موزوں بینی، لبوں پر پان کی ہلکی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وارنش کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ اُن کی تصویریں میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "شوکت تھانوی؟" مسکرا کر بولے۔ "آپ نے ٹھیک پہچانا۔" یہ کہہ کر معانقہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرکے بولے۔ "اور یہ؟" میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا، سوائے اس کے کہ اُن کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ آپ کے نفسِ ناطقہ نسیم انہونوی ہو سکتے ہیں۔" شوکت نے کہا۔ "بھئی خوب اندازہ لگایا۔" نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ اُن کا پرچہ "حریم" نکلتا تھا۔ اور "ساقی" کے مقابلہ میں آتا تھا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر "سرپنچ" ایک مزاحیہ اخبار (ہفتہ وار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر کوئی مضمون اُن کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ مخلص آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر بڑا کام کیا اور اب تو خود نسیم صاحب بھی ایک بھاری بھرکم مصنف ہیں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلی کی ایک خاص چیز ہے اور دلی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصبح کا ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آ جائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجیے۔ میں خود چوں کہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اُٹھتا ہوں۔ اُس دن الارم لگا

qasarulkutub.blogspot.com

کر اُٹھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دُوسرے لوازم لیے ہوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکائی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑایا گیا۔ نہاری پر سے تار اُتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سُرخ ہو گئی تو پیاز ایک الگ پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے اور سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا۔ "بھئی تمھارے مہمان نہیں آئے" میں نے کہا۔ "لکھنو والے ہیں تکلّف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے" لو صاحب، سات بھی بج لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ۔ اُس زمانے میں میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا۔ "ماموں جان، یہ سارا سامان زنانہ میں بھیج دیجیے" وہ گھبرا کر بولے۔ "کیوں میاں کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کر لو" مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب اگر وہ آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا۔" ماموں جان نے کہا۔ "یہ بڑی نامناسب بات ہو گی" مگر میں نے سارا سامان اُٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آ گئے۔ میں نے بیوی سے کہا۔ "چائے اور پان بھیج دینا" اُنھوں نے پُوچھا "اور نہاری؟" میں نے کہا۔ "اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہو گیا۔ اُسے مت بھیجنا" اُنھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں "عجیب اوندھی مت کا آدمی ہے" اور باورچی خانہ میں خاموش چلی گئیں۔ میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا: "ہمیں کچھ دیر ہو گئی" میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ ع

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند"

بولے: "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بُلایا تھا۔ انھوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھا پی کر رُخصت ہو گئے۔"

"یعنی نہاری ختم؟"

"جی ہاں۔ دِلّی کے شرفا سُورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چُکتے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدُوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بِکتی رہتی ہے۔"

"یہ تو بُرا ہُوا۔"

"وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کہیے کل کِس کِس سے مِلے؟"

شوکت صاحب نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ، ایڈیٹر "ریاست" سے ملے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملے اور پروفیسر اکبر حیدری سے مِلے۔ جو اس قدر تپاک سے مِلے کہ گھنٹوں اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ حکیم یُوسف حسن صاحب ایڈیٹر "نیرنگ خیال" بھی انھی کے ہاں ٹھہرے ہُوئے تھے۔ اُن سے بھی مُلاقات ہُوئی۔ اور رات کے کھانے پر بھی پروفیسر صاحب نے انھیں مدعو کر دیا۔"

یہ پروفیسر صاحب تھے تو دراصل انبالہ کے، مگر دِلّی ہی میں آ کر بَس گئے تھے۔ اُس زمانے میں بعض لوگ گوروں کو اُردو پڑھایا کرتے تھے اور منشی کہلاتے تھے۔ سب سے پُرانے مُنشی اُستاد بیخود دہلوی تھے۔ وہ اپنی کبرسنی کے باعث اِس پیشے کو چھوڑ چکے تھے۔ اکبر حیدری اچھے وجیہ آدمی تھے۔ اُن کی تعلیم شاید اسکول تک ہی محدُود رہی تھی۔ مگر اپنی ذہانت اور جوڑ توڑ سے اس پیشے میں گھُس گئے تھے اور اپنے ہم پیشہ سُسرالی عزیز کے سہارے بڑھتے چلے گئے، اور انھی کی طرح گوروں کے لیے دو ایک کتابیں بھی لکھ دی تھیں۔ جو کورس میں داخل ہو جانے کی وجہ سے خوُب بِکتی تھیں۔ چناں چہ منشی اکبر خاں دِلّی میں آنے کے بعد چند سال کی لوٹ پھیر میں خاصے مال دار ہو گئے تھے اور پھیلی دالان میں ان کا ایک عمدہ مکان بھی بن گیا تھا۔ شعر اچھے خاصے کہہ لیتے تھے، اور غمت از کے نام سے ایسی نثر بھی لکھ لیتے تھے جس میں کسی کو بُرا بھلا کہنا ہو۔ تموّل کے ساتھ اُن کے تعلّقات بھی وسیع ہوتے چلے گئے تھے اور وہ پروفیسر اکبر حیدری مشہُور ہو گئے تھے۔ ویسے طبیعت کے بھلے آدمی تھے۔ اور مِلنے جُلنے میں خوش اخلاق تھے۔ ہم سے بھی ان کی یاد اللہ تھی مگر ہم سے اُن کی میزان نہیں پٹتی تھی۔

شوکت صاحب نے بتایا تھا کہ رات کو ہم اُن کے ہاں دعوت میں گئے تو وہاں دو اور ایڈیٹروں سے بھی مُلاقات ہُوئی۔ ایک "نیرنگ" کے ایڈیٹر عشرت رحمانی اور دوسرے اخبار "ریاست" کے سب ایڈیٹر حنیف ہاشمی۔ حکیم یوُسف حسن صاحب اُن دِنوں

daraulkutub.blogspot.com

میں خاصے تنومند اور قوی الجثہ آدمی تھے، حنیف ہاشمی اسی قدر اعصابی اور نحیف الجثہ۔ اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں کہ حنیف ہاشمی پنجاب اور یوپی کا قضیہ لے بیٹھے۔ اکبر حیدری انبالہ کے تھے۔ نہ اِدھر کے، نہ اُدھر کے، بلکہ بین بین۔ بیچارے بار بار اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کرتے، مگر حنیف ہاشمی کانپ کانپ کر اور لرز لرز کر بھی کچھ کہہ دیتے۔ اِدھر یہ دونوں بھی کچھ کم بولنے والے نہیں تھے۔ پہلے تو انھوں نے کچھ ٹالا مگر جب وہ حد سے بڑھنے لگے تو یہ بھی پلٹ پڑے۔ غرض شوکت صاحب نے بتایا کہ فضا اتنی مکدّر ہو گئی کہ ہم وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر اکبر حیدری نے پکڑ کر بٹھا لیا اور فوراً کھانا منگوا لیا۔ مگر دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا، کھانا کیا خاک کھایا جاتا؟ دو چار لقمے زہر مار کر کے وہاں سے پیچھا چھڑایا۔

میں نے کہا۔ "مجھے یہ روداد سُن کر مطلق تعجب نہیں ہوا۔ اکبر حیدری جب اکیلے ہوتے ہیں تو نہایت معقول باتیں کرتے ہیں۔ مگر جب دو چار ادیب یا شاعر ان کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔ اُن کے گھر کی رونق ہی ہنگاموں پر موقوف ہے۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔

شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "تو کیا واقعی تمہاری نہیں ملے گی۔"

میں نے کہا "تمہاری اب آئندہ کسی اور موقعہ پر۔ اب تو آپ چائے پیجیے، اور پان کھائیے۔"

اس واقعہ کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہو گئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ وہ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انھوں نے میرے ساتھ کبھی مسخرا پن نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت تھانوی سے میرے تعلقات اڈیٹر اور مضمون نگار کے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے معاوضہ نہیں لکھتے۔ لہٰذا جب کبھی اُن سے مضمون لکھوانا ہوتا تو انھیں معاوضہ منی آرڈر سے بھیج دیا جاتا تھا۔ اور اُس زمانے میں معاوضہ ہی کیا ہوتا تھا؟ دس روپے۔ منشی پریم چند

پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی نے پندرہ روپے انھیں دیے ہیں تو اُن پر بڑا احسان کیا ہے۔ سو دو سو میں شوکت تھانوی اپنا ناول دینے پر تُلے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آغا سرخوش کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ آغا صاحب نے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟" کہا، "جو جی چاہے نام رکھ لو۔" آغا صاحب کو شوخی سوجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیدڑ بنوایا اور اس گیدڑ کا چہرہ شوکت تھانوی کا بنوایا۔ گیدڑ کو پنجرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا "مجھے خرید لو۔" یہ اَدب کے عروج اور ادیبوں کی پستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسودے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ للہ ہماری کتاب اپنے مکتبہ سے چھاپ دو۔

شوکت تھانوی میں خوبی کہیے یا عیب، یہ تھا کہ اُن کے کسی کام میں اُستواری نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے، اس لیے وہ زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے تھے۔ جب دِلّی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکت صاحب کو بھی تقریر کرنے کے لیے بُلایا گیا۔ اسے انھوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اُس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائرکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائرکٹر پروگرام۔ شوکت صاحب اِن دونوں بھائیوں سے مرعوب ہو گئے۔ کچھ کو ربھی دَبتی تھی۔ ایک ایک سے اِن کی تعریف کرتے پھرتے تھے، اور لکھنؤ واپس پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک اُردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) ان دونوں بھائیوں کا نثری قصیدہ لکھا اور اس کا تراشا انھیں بھیج دیا۔ اس کے صلہ میں انھیں دِلی مزید پروگراموں کے لیے بُلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھیں مسوّدہ نویس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ریڈیو میں انھیں اخبار کے مقابلے میں دُگنی بلکہ تگنی تنخواہ ملنے لگی اور ان کے دلدّر دُور ہو گئے۔ اخبار نویسی نے انھیں زُود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے ہی، فیچر اور ریڈیو ڈراما کی تکنیک کو سمجھ لینے کے بعد اُنھوں نے لکھ لکھ کر مسوّدوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔ نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے تھے۔ لکھنے میں اُنھیں

qasaaidkutub.blogspot.com

کوئی مشکل نہ ہوتا تھا، قلم برداشتہ لکھتے تھے، اچھا لکھتے تھے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر "منشی جی" شروع کیا، جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دل چسپ بحث ہوتی تھی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو "منشی جی" نے "قاضی جی" کا روپ دھار لیا۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا۔ پھر شوکت صاحب کراچی آگئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روحِ رواں قاضی جی تھے۔ جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے۔ مدتوں تک اکثر سننے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کر رہا ہے۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو احمقوں کی جنت میں رہتے تھے مگر ہر معاملہ میں اپنی رائے ضرور دیتے تھے۔ ان کے پوپلے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں، بھولی بھولی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے نقال پیدا ہو گئے تھے۔ اور محفلوں میں جو مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے، وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے تھے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سیکڑوں مسودے لکھے اور میں نے بھی ان کے بیسیوں براڈکاسٹ سنے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بھی بھرتی کا فیچر نہیں پایا۔ سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی۔

یہی کیفیت ان کی کالم نویسی کی تھی۔ مجید لاہوری کے انتقال کے بعد شوکت صاحب اخبار "جنگ" سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں روزانہ ایک مزاحیہ کالم "وغیرہ وغیرہ" لکھنا ہوتا تھا، اور ہفتہ میں دو ایک اداریے بھی۔ نواب سعادت علی خاں نے اِنشاء اللہ خاں سے فرمائش کی تھی کہ دو لطیفے روز سنا دیا کرو، تو چند روز میں اِنشا کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک ایک سے کہنے۔ "کوئی نقل، کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ۔ میں لون مرچ لگا کر نواب کو خوش کر لوں گا۔" شوکت کا شگفتہ رقم قلم روزانہ چلتا رہا اور ظرافت کے پھول کھلاتا رہا۔ پنڈی جانے کے بعد پورے اخبار کی ذمہ داری بھی ان پہ عاید ہو گئی تھی مگر وہ "پہاڑ تلے" کے عنوان سے کالم برابر لکھتے رہے

اداریہ کے علاوہ بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مثلاً انھوں نے آپ بیتی لکھنی شروع کر دی تھی۔ افسوس کہ اس کی چند قسطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پاکستان بننے سے شاید دو ڈھائی سال پہلے وہ دگنی تنخواہ پر پنچولی فلم کمپنی، لاہور میں مکالمہ نویسی کے لیے چلے گئے تھے۔ اس کمپنی میں انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے ساتھ کام کیا۔ فلم کا سیناریو نیز کلف لکھنے لگے تھے۔ یہیں ایک فلم میں انھوں نے اداکاری بھی کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد: "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" —— تاج صاحب کے ساتھ وہ بھی لاہور ریڈیو میں آگئے تھے۔ پاکستان کے تعمیری پروگرام میں انھوں نے "قاضی جی" لکھنا شروع کیا تھا اور سب سے زیادہ مقبول پروگرام انھی کا ہوتا تھا۔

"یک در گیر و محکم گیر" کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے، پیسے کے میت تھے جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا دکھائی دیتا اسی کو اختیار کر لیتے۔ کالم نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آئے۔ ریڈیو چھوڑ کر پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو پنچولی فلم کمپنی میں آگئے، وہ بند ہوئی تو پھر ریڈیو میں آگئے۔ پھر "جنگ" اخبار میں چلے گئے۔ پیسہ انھوں نے خوب کمایا، مضامین سے، کتابوں سے، ریڈیو سے، اخباروں سے، مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے تھے۔ پانوں کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سگریٹ تک وہ نہیں پیتے تھے۔ سنیما، تھیٹر، کلب، سیر سپاٹا، دعوتیں، ہوٹل بازی یا کوئی اور بازی، کچھ نہیں۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا۔ اور انھیں کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے تھے۔

شوکت تھانوی کا کمزور پہلو ان کی شاعری تھی۔ وہ ساری عمر شعر کہتے رہے۔ آسی الدنی کی انھوں نے شاگردی بھی اختیار کی۔ مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ کوئی ۲۵ سال ہوئے، انھوں نے اپنے منتخب کلام کا مجموعہ "گہرستان" کے نام سے شائع کیا تھا مگر شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی نمود حاصل نہیں ہوئی۔ شعر کلام موزوں کے علاوہ اور بھی کچھ ہوتا ہے۔ "یہ اور بہت کچھ" شوکت کے کلام میں نہیں تھا۔ چند سال سے انھوں نے مزاحیہ اشعار اور طنزیہ نظمیں بھی کہنی شروع کر دی تھیں۔ یہ اثر تھا سید محمد جعفری کی صحبت کا جن کے سلسلے میں انھوں نے دو ایک

daarulkutub.blogspot.com

نظمیں ہی ہیں، مگر ان میں وہی آورد اور بے رنگی ہے جو ان کے سنجیدہ کلام کا عیب ہے۔
شوکت صاحب کا معاملہ کچھ اکبر الہ آبادی سے ملتا جلتا تھا۔ اکبر کی شاعری کا آغاز سنجیدگی سے ہوا۔ مدتوں اس بحر میں شناوری کرتے رہے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ پھر ایک بار اتفاق سے جو غوطہ مار کر نکلے، تو دُرِ مقصود ہاتھ آگیا۔ یہ موتی تھے طنز و مزاح کے، جن کی مانگ چاروں طرف سے ہونے لگی۔ تب اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کا فطری جوہر ظرافت ہے اور انھیں اسی جوہر کو اُجالنا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے اسے مشق کی سان پر چڑھایا اور مزاح سے ایسے پہلو تراشے کہ اس کی آب و تاب ایک دیکھنے دکھانے کی چیز بن گئی۔ شوکت صاحب بھی برسوں اخباروں میں لکھتے رہے، مگر جب حُسنِ اتفاق سے "سودیشی ریل" ان کے قلم سے نکلی تو اس کی مقبولیت نے انھیں بتایا کہ ان کا جوہرِ اصلی مزاح ہے۔ اگر نمود چاہتے ہو تو اسی کو چمکاؤ۔ چنانچہ شوکت نے اپنی بساط بھر اسے چمکایا، اور اس تیز رفتاری سے کہ دو سال ہی میں موجِ تبسم، بحرِ تبسم اور دو اور تبسم، چار مجموعے ان کے مضامین کے شائع ہوگئے۔ مگر ان کی زود نویسی نے انھیں طنز و مزاح کی بلندیوں کو چھونے نہیں دیا۔ آج تک ایورسٹ کی چوٹی کسی نے دوڑ کر سر نہیں کی۔ یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے جس میں قدم قدم پر احتیاط کرنی ہوتی ہے۔ اور کوئی بڑا ہی خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنا جھنڈا گاڑ کر لافانی ہو جاتا ہے۔ دوڑ کر ہانپ جانے والوں میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی ہیں۔ قدم قدم چل کر چوٹی تک پہنچنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس۔ ثانی الذکر نے زندہ سلامت واپس آجانے کے بعد کوہ پیمائی کا سامان ایک طرف ڈال دیا۔ صدیقی صاحب بہت زیادہ سخت کوش ہیں۔ تن سنگھ کی طرح بار بار چوٹی پر دھاوا بولتے رہتے ہیں۔

شوکت تھانوی خوش اخلاق آدمی تھے، اور جن سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے تھے، ان سے تعلقات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ مگر وہ دوست صرف انھیں بناتے تھے جن سے انھیں فائدہ پہنچتا تھا یا فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔

باتوں کے طوطا مینا بنانا یوں تو سبھی یوپی والوں کا شیوہ تھا مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جنّوں کو

شیشے میں اتار رکھا تھا، اور ان سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھاتے تھے۔ میں اُن سے کہا کرتا تھا کہ تم بے تہی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی ہاں جی ہاں کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ کہتے تھے۔ "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔"

ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم سے کھڑے ہوگئے اور بولے۔ "ایک لطیفہ یاد آگیا، ذرا نظامی صاحب (اسٹیشن ڈائرکٹر) کو سنا آؤں۔" وہ لطیفہ سنانے چل دیے۔ میں نے ان کے دوست سے کہا۔ "اس نے تو خوشامد کرنے کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" انھوں نے کہا۔ "بھیّا، یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ پول سننگ بڑی چیز ہے۔"

"یہ نیا لفظ تم نے کیا بولا؟"

"پول سننگ۔"

"یعنی؟"

"بٹرنگ ــــ مکھن لگانا ــــ پول سن کا مکھن ہوتا ہے نا!"

پول سننگ، بٹرنگ، مکھن لگانا، مکھن بازی کرنا۔ یہ سارے محاورے اُسی زمانے میں وضع ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے اُسی زمانے میں کہا تھا۔ "آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے۔"

"کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا؟"

"نہیں، فلاں صاحب نے فلاں افسر کے لگا دیا سارا۔"

ایسی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی اور جی بھی جلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا۔ انھوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہوگئے تھے۔ جب عام مقولہ یہ ہو کہ ؎

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

تو پھر کسی ایک کو ہدفِ ملامت کیوں بنایا جائے؟ ایسا ہی [illegible] اور خودداری کا اگر خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دُنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔ صرف دو مدیں ایسی

qasarulkutub.blogspot.com

دکھائی دیں جن میں انھیں ضرور اپنی گرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی۔ ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے تو کم تھے، کھلاتے زیادہ تھے۔ انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل کی بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا تھا۔ یہ ڈبیا تقریبِ بہرِ ملاقات بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اُس پر بٹوے سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الائچی، لونگ، جاوتری، منقال کی ننھی سی شیشی، سبھی کچھ ہوتا تھا۔ کہاں تک کوئی بچتا، مار ہی کھا جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی، سخن بازی، نو وارد رام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا۔

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریلوے اسٹیشن لاہور پر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے "آپ کو دیکھیے نیوی کٹ سگریٹ پر آپ کی تصویر ہے۔" اور واقعی میں اُس غریب کی عین مین وہی شکل تھی جو نیوی کٹ کی ڈبیا پر ہوتی تھی۔ پھر اس سے کہا۔ "جائیے، جا کر چائے لائیے۔"

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں اُن کے کمرے میں داخل ہُوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی۔ "یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں، میرے صاحب زادے ہیں" اور ان صاحب سے کہا۔ "انھیں تم جانتے ہی ہو گے، شاہد احمد دہلوی ہیں۔" انھوں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ میں "وعلیکم السّلام" کہہ کر بیٹھ گیا۔ وہ صاحب "اچھا، میں چلتا ہوں" کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا۔ "جس بھلے آدمی کو دیکھتے ہو کسی کو اپنا بیٹا اور کسی کو اپنا باپ بنا لیتے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی؟" بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "نہیں واقعی میرا بڑا لڑکا تھا۔ پی، اے ایف میں نوکر ہے۔" مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اتنے میں عشرت رحمانی آ گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ "اِن کا کوئی لڑکا اِن سے بھی بڑا ہے؟" انھوں نے کہا۔ "قد میں بڑا ہے۔ آپ اِن کی عمر کیا سمجھتے ہیں؟ — مجھ سے، آپ سے، بڑے ہیں یہ حضرت۔ پچاس سے اوپر ہیں۔ ۳۰۔۳۲ سال کا تو لڑکا ہی ہے۔" اُس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے تھے۔ بال خوب گھنے اور کالے تھے۔ سفید بال نہ تو سر میں تھے نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھُرّی نہیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں "کوّے کے پاؤں"۔ دس بارہ سال بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں بالکل ایسے ہی تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں بُردباری اور سنجیدگی آ جایا کرتی ہے مگر شوکت صاحب

کی بات چیت کا انداز بالکل نہیں بدلا تھا۔ جوانی کا وُہی چلبلاپن قائم تھا، بلکہ مسخراپن کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ مارچ ۱۹۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیرسگالی کا ثقافتی وفد گیا تھا اُس میں لاہور سے امرت سر تک اور امرت سر سے دلّی تک ذوالفقار بخاری، سیّد محمد جعفری، شوکت تھانوی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی بذلہ سنجی اور چرب زبانی سے سب کو دبا لیا کرتے ہیں، مگر اس سفر میں شوکت تھانوی نے سب کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

پان کے خرچ کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر مجبور تھے۔ وہ روزانہ ایک جوڑا بدلتے تھے اور ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ بعد میں سُوٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزّت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ جیسے الغریب خواہ مخواہ مردِ معقول ہوتا ہے اسی طرح بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزّز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ میرے پُرانے ہم جماعت اور بے تکلّف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلوا بھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آ جاؤ، ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت سیکریٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے سبھاؤ اُن کے دفتر وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چپراسی مُرغِ زرّیں بنا باہر کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اُسے دیا کہ صاحب کو دے آئیے۔ اُس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں۔" میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر بعد آ کر مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بنچ پر آ بیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ اُس نے مجھ سے بات کرنی بھی گوارا نہ کی۔ میں نے کہا "آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آئیے۔ مناسب سمجھیں گے تو بُلا لیں گے۔" بولا۔ "اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ ابھی ٹھہرو۔" ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزر گیا تو میں نے کہا۔ "صاحب نے مجھے بُلایا ہے، میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا ہوں۔ آپ اطلاع تو کر دیجیے۔" وہ میری چِٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چِٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لیے چلا گیا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آ کر خاموش

qasrulkutub.blogspot.com

بیچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ "چٹ نہیں دی؟" اُس نے "نہیں" کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جلتا رہا، جلتا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک اُن کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے۔ "ارے! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں، پون گھنٹے سے۔ اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے دفتر نہ بلائیں۔ میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ "آیئے آیئے" کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ بولے۔ "آپ اندر کیوں نہ آ گئے؟" میں نے کہا۔ "وہ جو باہر ایک کُتا کھڑا ہے اُسے میں نے چٹ دے دی تھی۔ مگر اُس نے اندر نہیں پہنچائی۔ کیا آپ کے ہاں بھی اندر اطلاع پہنچانے کے دس پانچ روپے دیے جاتے ہیں؟" ہنس کر کہنے لگے۔ "نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا۔" پھر میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بولے۔ "آپ چائے پئیں گے، کچھ کھائیں گے؟" اور بغیر میرے جواب کا انتظار کیے گھنٹی بجا کر اپنے مُرغِ زرّیں کو بُلایا اور کہا۔ "چائے لاؤ۔" پھر خود ہی کہنے لگے۔ "بھائی کیا پوچھتے ہو ان چپراسیوں کی حالت۔ بس کچھ کہنے کا مقام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جناب اُس کی گرم شیروانی میری شیروانی سے دُگنی قیمت کی ہے۔ میرے پاؤں میں چھ روپے کی جُوتی ہے، وہ تیس روپے کا شُو پہنے ہوئے ہے۔ بھلا وہ مجھے کیوں خاطر میں لاتا۔ سمجھا ہوگا کہ کوئی غرض مند مہاجر صاحب سے کچھ مانگنے آیا ہوگا۔" ممتاز صاحب شرمندہ ہو کر بولے۔ "نہیں بھائی نہیں۔ تم مجھے معاف کر دو۔"

تو شوکت صاحب ہمیشہ دیسی یا ولایتی عُمدہ لباس پہنا کرتے تھے۔ ورنہ انھیں بھی ایسے ہی حادثات سے دوچار ہونا پڑتا۔ مثل مشہور ہے "الناس باللباس"۔ یہ کوئی آج کا دستور نہیں ہے، قدامت سے یہی چلا آتا ہے۔ شیخ سعدی کو دعوت میں داخل ہونے سے دربان نے روک دیا تھا۔ جب وہ جُبّہ قبّہ پہن کر آئے تو عزّت و تکریم کے ساتھ انھیں اندر پہنچایا گیا۔ جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شوربے میں اپنی آستین ڈالتے ہوئے فرمایا "پہلے تُو کھا۔" لوگوں نے کہا۔ "حضور یہ کیا۔" فرمایا۔ "اسی نے تو مجھے کھانے تک پہنچایا ہے۔" سچ ہے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کو نہیں۔ لہٰذا مرزا ظاہر دار بیگ بننے ہی میں عزّت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خُوبی یہ تھی کہ شاعروں کے ساتھ اور اُونچی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے۔ آئے دِن غیر مُلکی سفارت خانوں میں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بلکہ ہمارے "بڑے آدمیوں" نے بھی اسے اپنی شانِ امارت میں داخل کر لیا ہے کہ جب ان کے ہاں "معزّز مہمان" آ رہے ہوں تو ایک "بار" کا بھی اپنے ہاں اہتمام کریں۔ مُفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے، مگر ان "قاضی جی" نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے ایسے ایسے ثقہ لوگوں کو چُسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

عورتوں کے باب میں بھی شوکت صاحب تدیدے نہیں تھے۔ بلکہ خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہُوا، چھوٹتے ہی سمجھ لیا کہ پہلی ہی نظر میں وہ اُن پر عاشق ہو گئی۔ اور لگے اُس کی فرضی داستانیں سُنانے۔ شاید اس وضعِ احتیاط کی وجہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی تو جوانی ہی میں ہو گئی تھی۔ انھی کی بے تکلف گفتگو سے معلوم ہُوا تھا کہ کبھی وہ اُس شب "بلی" جنگلی جٹی بھی بو لیا کرتے تھے۔" مگر اس کا انھیں لپکا نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک طرح دار جوان تھے۔ وہ اگر بگڑنا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کر بگڑتے، مگر اللہ نے انھیں اس خرابی سے محفوظ رکھا — وہ بھی کیسی حد تک!

۱۹۶۳ء

qasarulkutub.blogspot.com

مولانا نیاز فتح پوری

۲۴ مئی (۱۹۶۶ء) کو صبح کی خبروں میں ریڈیو پاکستان نے یہ غم ناک خبر سُنائی کہ اُردو کے مشہور نقاد اور ادیب نیاز فتح پوری کا انتقال ہو گیا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

نیاز صاحب کی سُناؤنی سُن کر مجھے تعجب نہیں ہُوا، البتہ دل پر غم و اندوہ کا ہجوم ہو گیا۔ تعجب یوں نہیں ہُوا کہ نیاز صاحب کئی مہینے سے علیل تھے۔ معلوم ہُوا تھا کہ اُن کے مُنہ میں کچھ تکلیف ہو گئی ہے۔ اُس وقت خیال ہُوا تھا کہ شاید نقلی بتیسی کی کسی خرابی کی وجہ سے یہ تکلیف ہو گئی ہو گی۔ مگر پھر یاد آیا کہ نیاز صاحب نے کبھی نقلی بتیسی لگائی ہی نہیں۔ میں نے اُن کے پوپلے مُنہ کو دیکھ کر خود اُن سے ایک دعوت میں پوچھا تھا کہ 'آپ اپنا چوکا کیوں نہیں بنوا لیتے؟' میرے اِس بدتمیزی کے سوال پر اُنھوں نے متبسم ہو کر فرمایا تھا کہ "ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے مُنہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اِس میں بتیسی لگائی جائے۔" میں نے سوچا کہ جیسے نیاز صاحب کی ہر بات میں ایک انوکھا پن ہوتا ہے، یہ بھی ایک انوکھی بات ہے کہ نقلی دانت اُن کے مُنہ میں نہیں سما سکتے۔ پھر میں نے کھانے کے دَوران میں مولانا کی طرف دیکھا تو وہ بغیر کسی زحمت کے کھانا کھا رہے تھے۔

ہاں تو نیاز صاحب کے انتقال کی خبر سُن کر مجھے تعجب نہیں ہُوا۔ کیوں کہ بعد میں اُن کی تکلیف کے بارے میں ڈاکٹروں کی متفقہ رائے یہ ہو گئی تھی کہ یہ کینسر ہے۔ میں تو اُسی دن مایوس ہو گیا تھا کہ اب مولانا کی زندگی کے دِن شمار ہو چکے ہیں۔ بہت جئیں گے نو سال چھ مہینے، اور ہُوا بھی یہی۔ مثل مشہور ہے کہ جب تک سانس تب تک آس۔ مولانا کے کینسر کو ریڈیم سے جلانے کا علاج کیا گیا، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کوبالٹ سے علاج ہُوا، افاقہ نہیں ہُوا ع

مرض بڑھتا گیا، جُوں جُوں دوا کی

پھر معالجوں نے اپریشن تجویز کیا اور مولانا اِس تکلیف کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اپریشن ہو گیا اور نیاز صاحب اچھے ہونے شروع ہو گئے۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ میرا اندیشہ غلط نِکلا۔ مولانا پھر لکھنے پڑھنے بھی لگے اور اُن کی افسردگی بھی دُور ہو چلی تھی، کہ مَرض پھر عود کر آیا۔ بیچ میں صحت کا جو تھوڑا سا وقفہ آیا تھا وہ گویا مولانا نے سنبھالا لیا تھا۔ اب کے جو مَرض بڑھنا شروع ہُوا تو جان لے کر ہی ٹلا۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اِس کا ہے کہ مولانا کا آخری دیدار نہیں کر سکا۔ میں خود تین مہینہ سے قیدِ بستر میں تھا۔ اور چلنے پھرنے سے معذور۔[1]

مولانا نیاز فتح پوری کی ادبی زندگی کا آغاز اِس صدی کے آغاز کے ساتھ ہُوا۔ وہ سر عبدالقادر کے "مخزن" کے لیے مضامین لکھتے تھے اور چوں کہ ایک طرزِ خاص کے لکھنے والے تھے۔ اِس لیے عبدالقادر صاحب ان کے مضامین کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ اِس وقت یعنی اب سے کوئی ساٹھ سال پہلے نیاز صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کی اکثر نظمیں بھی مخزن میں شائع ہوتی تھیں۔ اُن کی طبیعت روایتی غزل گوئی سے نفور تھی۔ خوب سے خُوب تر کی جُستجو میں ایک سے ایک اچھی نظم کہتے تھے۔ اُن کی نثر میں بھی شاعرانہ عُنصر بہت نمایاں تھا۔ اور اُن کے فقروں میں وُہی لطف آتا تھا جو ایک اچھا شعر سُن کر حاصل ہوتا ہے۔ نیاز صاحب کی ابتدائی تعلیم اُسی انداز پر ہُوئی تھی جو قدیم مُسلمان شُرفا کا دستور تھا، یعنی عربی فارسی کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی انھیں ملی۔ گھر کا ماحول بھی مذہبی تھا۔ اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ جوان ہوتے ہی نیاز صاحب کے چہرے پر ایڈورڈ فیشن کی ڈاڑھی تھی

---

[1] "میری دائیں ٹانگ کا دورانِ خون بند ہوتا جا رہا تھا۔ جب دواؤں اور اِنجکشنوں سے فائدہ نہیں ہُوا تو فوراً خون کی رگ کا بڑا اور خطرناک اپریشن سرجن ڈاکٹر عباس سے کرانا پڑا ورنہ ٹانگ ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اپریشن کے بعد پچاس دن تک بستر سے پاؤں نیچے نہیں اتار سکتا تھا۔ ڈھائی مہینے بعد چھڑی کے سہارے چند قدم چلنے کے قابل ہُوا۔ اب تین مہینے بعد بھی زیادہ نہیں چل سکتا۔ بس کوئی دو سو قدم۔" (شاہد احمد دہلوی)

qasrulkutub.blogspot.com

اسی ڈاڑھی کی وجہ سے وہ "مولانا" کہلائے۔ آگے چل کر جب ڈاڑھی غائب ہوگئی تو "علامہ" کہلانے لگے۔

نیاز صاحب نے اسکول میں انگریزی بھی پڑھی تھی مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ کالج کی تعلیم حاصل نہ کر سکے اور سب انسپکٹر پولیس ہو گئے۔ مگر ملازمت کی قید و بند انھیں گوارا نہ ہوئی اور نوکری چھوڑ چھاڑ ہمیشہ کے لیے ادب کے ہو رہے۔

۱۹۱۳ء میں آگرہ سے شاہ دلگیر نے ماہنامہ "نقاد" جاری کیا۔ اس کے مخصوص لکھنے والوں میں مہدی افادی اور نیاز فتح پوری تھے۔ خود شاہ دلگیر اچھے شاعر اور بہت اچھے نثر نگار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک اچھا فقرہ لکھنے کے لیے ہمارے بعض اہلِ قلم کئی کئی دن الفاظ کی تلاش میں گزار دیتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ نیاز صاحب ٹیگور سے متاثر ہونے شروع ہوئے اور "گیتا نجلی" کا ترجمہ انھوں نے "عرضِ نغمہ" کے نام سے کیا۔ یہی ترجمہ ہمارے ان شاعرانہ ادب پاروں کی بنیاد ہے جنھیں "ادبِ لطیف" کا نام دیا گیا۔ نیاز صاحب آسکر وائلڈ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ بالخصوص اُس کی نثری نظموں سے۔ نیاز صاحب کی البیلی نثر کا تتبع تو بھلا کون کر سکتا تھا۔ ہاں نقالی میں ایک جمِ غفیر نے لکھنا شروع کر دیا۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

وہ مٹی پلید کی ان نقالوں نے ادبِ لطیف کی کہ لوگ اس کے نام سے گھن کھانے لگے۔
نقاد چند سال چل کر بند ہو گیا مگر اپنی ایک روایت چھوڑ گیا ؎

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

نقاد کے کچھ عرصہ بعد لکھنے والوں کا ایک حلقہ "یارانِ نجد" کے نام سے قائم ہوا۔ اس میں من جملہ دیگر اہلِ قلم حضرات کے نیاز فتح پوری، دلگیر اکبر آبادی، خلیقی دہلوی، مخمور اکبر آبادی، اور ل۔ احمد (یعنی لطیف الدین احمد) جیسے جلیل القدر ادیب شامل تھے۔

"یارانِ نجد" ہی کی تحریک پر آگرے سے ماہنامہ "نگار" جاری ہوا جس کے رئیس التحریر نیاز فتح پوری مقرر ہوئے۔ اس بات کو اب ۴۴۔۴۵ سال ہو گئے۔ نیاز صاحب کے قلم

کا شباب اور ل۔ احمد کی نگارشِ لطیف کے جوہر بھی نگار میں کھلنے لگے۔ نگار کے علمی اور ادبی مضامین نے سارے ملک میں دھوم مچا دی۔

نیاز صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بھی کام کر چکے تھے اور مولانا کے طرزِ تحریر سے بھی متاثر ہوئے تھے مگر مولانا کی ادق بلاغت کو سہل الفہم بنا کر نیاز صاحب نے اپنے اسلوب میں ڈھال لیا تھا۔ بات کہنے کا انداز نیاز صاحب کا سب سے جداگانہ تھا۔ پڑھنے والے اُن کی نگارشات پڑھنے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ ان کے اندازِ بیان پر بڑے بڑوں نے ہاتھ ڈالا مگر اس کی سادہ پرکاری کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ نیاز صاحب اپنے اسلوبِ تحریر کے خود ہی مخترع بھی تھے اور خود ہی خاتم بھی ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

نیاز صاحب نے زمانۂ شباب ہی میں اپنا ناول "شہاب کی سرگزشت" لکھا تھا۔ نوجوانوں کے لیے یہ ناول حرزِ جاں بن گیا تھا۔ در اصل یہ ناول اتنا زیادہ ناول نہیں ہے جتنا کہ ایک ادبی شہ پارہ۔ اس کے فقرے کے فقرے لوگوں کو ازبر تھے۔ نیاز صاحب کے ایک غائبانہ عاشق شہاب کی سرگزشت سنانے بیٹھے تو پوری رات سنا کر ہی اُٹھے۔

نگار اور نیاز کا یہی زمانۂ عروج تھا کہ نیاز صاحب نے ادبیات سے توجہ کم کر کے مذہبیات سے التفات بڑھانا شروع کر دیا۔ ڈاڑھی اُن کے چہرے سے معدوم ہوگئی۔ غالباً یہ ان کا تشکیک کا دور تھا۔ معقولات کی حد سے گزر کر نیاز صاحب نے مضحکہ خیزی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کے خطرناک نتائج نکلنے ہی تھے۔ ان پر مولویوں کی یلغار ہوئی۔ کفر کے فتوے لگائے گئے اور اُن کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ اُن سے معافی نامہ شائع کرایا گیا۔ ایک دور وہ تھا اور ایک دور لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ نیاز صاحب نہایت پابندیٔ اوقات سے نماز پڑھ رہے ہیں۔

نیاز صاحب کی وفات کی خبر سن کر اتنے بے شمار واقعات یاد آ رہے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کس کو بیان کروں۔ نیاز صاحب ایک جوہرِ قابل تھے۔ انھوں نے بڑی محنت

qasarulkutub.blogspot.com

سے اپنی زندگی بتائی تھی اور اپنا وقار قائم کیا تھا۔ وہ شاعر تھے۔ اِنشا پرداز تھے۔ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ نقّاد تھے۔ صحافی تھے۔ عالم تھے۔ فاضل تھے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم انسان تھے۔

نیازؔ صاحب بہت خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ کسی قدر لیے دیے بھی رہتے تھے۔ پہلی ملاقات میں لوگوں کو اُن کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ عام طور سے لوگ انھیں مغرور اور مُدمّغ سمجھتے تھے۔ بعض نوجوان اُن کی کتابیں پڑھ کر بڑی عقیدت سے اُن سے مِلنے جاتے تھے۔ نیازؔ صاحب ایک مصروف آدمی تھے۔ انھیں ہر وقت پڑھنے لکھنے سے کام رہتا تھا۔ پھر اپنی تعریف سُن کر اُنھیں وحشت ہوتی تھی۔ مُلاقاتی صاحب السلام علیکم رسید کر کے مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیتے۔ نیازؔ صاحب ہاتھ سے قلم رکھتے۔ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے اور سخت اکراہ کے ساتھ ہاتھ بڑھاتے۔ وہ صاحب اپنے دونوں ہاتھوں سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کے نرم و نازک ہاتھ کو مُلتے دلتے اور اس عمل سے فراغت پا کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر مَل کر سامنے کرسی پر ڈٹ جاتے۔

"بڑا اشتیاق تھا آپ سے مِلنے کا۔"

نیاز صاحب کہتے۔ "جی"۔ اور اپنے کاغذات سنبھالنے لگتے۔ وہ فرماتے "آج یہ حسرت پوری ہوگئی۔"

نیازؔ صاحب کہتے۔ "جی"۔ اور اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگتے۔ وہ فرماتے "لکھنؤ ایک کام سے آیا تھا، مَیں نے کہا آپ سے بھی نیاز حاصِل کرتا چلوں۔"

نیازؔ صاحب کہتے۔ "جی"۔ اور اُٹھ کر الماری کی طرف جاتے۔

وہ فرماتے۔ "آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ مجھے اجازت ہے۔"

نیازؔ صاحب کہتے۔ "جی۔"

وہ صاحب سلام داغ کر رخصت ہو جاتے اور دِل میں کہتے کہ "بڑا مغرور آدمی ہے، لا حَول وَلا قُوّۃ!"

مگر جن سے نیازؔ صاحب کی دِل کی جوادی کھُل جاتی، وہ جانتے ہیں کہ کِس قدر خوش اَخلاق اور خوش گُفتار تھے۔ جب اُن کی جان پر بنی ہوتی تھی اُس وقت بھی وہ بعض پُرسانے

مِلنے والوں کی خاطر پلنگ پر سے اُٹھ کر باہر آ جاتے تھے۔ بیمار پُرسی کرنے والا خود شرمندہ ہوتا کہ اس حالت میں انھیں کیوں تکلیف دی۔ خود ہی کہہ دیتا کہ آپ آرام کیجیے۔

نیازؔ صاحب پُرانے عالموں کا آخری نمونہ تھے۔ وہ ہر علم میں تیرے ہوئے تھے۔ معلومات کی ENCYCLOPEADIA۔ ساری عمر علم و اَدب کی خدمت کی اور فارغ البالی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ سُنا ہے کہ علم و دولت کبھی یک جا نہیں ہوتے۔ نیازؔ صاحب دولتِ دُنیا سے محرُوم مگر دولتِ علم سے مالا مال تھے۔ دولت کا کیا ہے؟ آج ہے کل نہیں۔ عِشق کی طرح عِلم کی دولت بھی لازوال ہوتی ہے۔ نیازؔ صاحب کے عِلمی کارنامے رہتی دُنیا تک زِندہ و تابندہ رہیں گے ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زِندہ شُد بعشق
ثبَت اَست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

۱۹۶۶ء

qasarulkutub.blogspot.com

فیضؔ احمد فیضؔ

کوئی تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ دِلّی میں سجّاد ظہیر ایک دفعہ آئے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی معرفت مجھ سے مِلنے کے خواہش مند ہوئے۔ کتاب "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکی تھی۔ یہ ساجھے کی ایک باڈلی ہنڈیا تھی، جو ادب کے چوراہے پر پھوٹی تھی۔ اس کے ایک ساجھی سجّاد ظہیر بھی تھے۔ اِس لیے میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے گھر چائے پر بُلایا اور سجّاد ظہیر سے مِلوایا۔ بہت ہوش مند آدمی نِکلے۔ لندن میں کئی سال رہ کر واپس آئے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور بُردبار۔ ہنستے بھی تھے تو خندہ دنداں نما سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انھوں نے انجمن ترقّی پسند مصنّفین دِلّی میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی، اور اس انجمن کے مقاصد بیان کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ مہربانی مجھے اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس وقت "ساقی" کا سُورج چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر ترقّی پسندی اسی کا نام ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے، تو ٹھیک ہے۔ انجمن قائم ہو جائے گی۔" اور انجمن انصارؔ ناصری اور فضلِ حق قریشی کی مدد سے قائم ہو گئی۔ دِلّی کے تقریباً سبھی بڑے ادیب، اُردو اور ہندی کے، اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اور مضامین پڑھنے لگے۔ جلسے باری باری مختلف گھروں میں ہوتے تھے۔ کبھی میرے ہاں، کبھی ناصریؔ صاحب کے ہاں، کبھی خیریؔ صاحب کے ہاں اور کبھی جینندر کمار کے ہاں۔ ایک ایسا ہی جلسہ چاندنی چوک میں نیل کے کٹرے کے پہلو میں ڈاکٹر شوکت انصاری کے بالا خانے میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر انصاری کے بہت قریبی عزیز تھے اور اُنھی کی طرح گاڑھے کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔

حالاں کہ برسوں پیرس میں رہ کر آئے تھے۔ اس جلسے میں ایک طرف ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جن سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہماری انجمن کے دو ایک جلسوں کے بعد ہر جلسے میں دو ایک نئے آدمی آنے لگے تھے۔ پہلے تو ہم انھیں ادیب یا شاعر ہی سمجھتے رہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سی۔آئی۔ڈی والے ہوتے ہیں۔ اگلی دفعہ میں نے انھیں جلسے میں سے نِکال دیا۔ اور ان کے محکمے کے افسر عبدالرحمٰن صاحب سے شکایت کی۔ وہ ایک ہی گرگِ باراں دیدہ تھے، بولے۔ "آپ کو رُوس سے کتنی رقم ملتی ہے؟" میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔" بولے۔ "تو پھر آپ ان کمیونسٹوں میں کیسے پھنس گئے؟" میں نے کہا۔ "رُوس یا کمیونسٹوں سے اس انجمن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" بولے۔ "آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کا ریکارڈ بالکل صاف ہے، بہتر ہے کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں یا کوئی اور انجمن بنا لیں۔ ورنہ آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" میں نے گھر آ کر سجّاد ظہیر کو پوری رُوداد لکھی اور پوچھا کہ اگر کل کلاں کو میں قید ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟ جواب آیا۔ "ہم کسی قسم کی مدد نہیں کر سکیں گے۔" ان کے اس خلوص سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے دِلّی کی انجمن فوراً بند کر دی، اور اس کی بجائے "انجمن تہذیبِ ادب" قائم کر دی۔ میں نے اپنی پیش رو انجمن سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اور اس کے جلسوں میں سی۔آئی۔ڈی کے لوگ بھی نہیں آتے تھے۔

ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک اجنبی شخص نظر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جا کر پوچھا "یہ کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب کسی قدر حیران اور شرمندہ ہو کر بولے۔ "آپ انھیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیضؔ ہیں۔ اسلامیہ کالج امرتسر میں پروفیسر ہیں۔" میں پھر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی چھپانے کے لیے خاموش ہو رہا۔ جلسہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔ مضامین پڑھے گئے۔ ان پر گفتگو ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ واہ وا ہوئی۔ آخر میں جنابِ صدر نے فیضؔ صاحب سے کلام سُنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے ازراہِ انکساری نہیں نُکّر کی۔ مگر جب انھوں نے اپنی ایک نظم سُنائی تو ہم سب کے کان کھڑے ہوئے اور دیدے پھٹے کہ یہ پربین شاعر اب تک کہاں چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے "ایک اور، ایک اور" کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب ان کا کلام سُن کر بہت خوش ہوئے اور

qasarulkutub.blogspot.com

وقتِ رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اور اُن کی تعریف کی۔

یہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد تین چار سال بعد لاہور میں مشہور ادیب ایم اسلم صاحب کے مکان پر ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے ساتھ فیض صاحب سے دوسری مُلاقات ہُوئی۔ وہ کم گو آدمی ہیں اور مجھے بھی زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ لہٰذا سلام دُعا اور مزاج پُرسی سے آگے بات نہ چلی۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلم صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر تاثیر کی میم صاحب کے ساتھ جو اُن کی ایک بہن آئی تھیں، ان سے فیض صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔ لہٰذا فیض اور تاثیر اب ہم زُلف ہو گئے ہیں۔

جب دوسری عالم گیر جنگ نے زور پکڑا تو یہ عجیب کایا پلٹ ہُوئی کہ ہمارے بعض ادیب، جو فرنگی حکومت کے سخت مخالف تھے، فوجی دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لیے ایک دَم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے مجید ملک فوجی وردی پہنے نئی دِلّی میں دکھائی دیے۔ مجھے تو جھٹکا سا لگا مگر وہاں آنکھ پر مَیل بھی نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر تاثیر ایک فوجی دفتر کے ڈپٹی ڈائرکٹر بن کر آ گئے۔ انھیں دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہُوا کیوں کہ یہ تو کھدر کا کُرتا اور کھدّر کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب دکھائی دیے۔ کپتان کی وردی پہنے ہوئے۔ حد یہ کہ کچھ دنوں بعد چراغ حسن حسرت بھی وردی پہنے ایک فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرنے لگے۔ ایک صاحب تھے عارف آل انڈیا ریڈیو میں، انھوں نے بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پہن لی۔ ایک اور صاحب تھے بدر، وہ بھی وردی میں دکھائی دینے لگے۔ حد یہ کہ ن م راشد بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے۔ وردی میں سب سے بے ہنگم حسرت مرحوم اپنے بے ڈول جسم اور فٹ بھر آگے چلنے والی توند کی وجہ سے لگتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے وردی کو نہیں بلکہ وردی نے انھیں پہن لیا ہے اور سب سے زیادہ افسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ شریف آدمی کس چکر میں پھنس گیا؟ اس وقت روایت یہ مشہور تھی کہ تاثیر نے فیض کو پھانسا ہے تاکہ وہ فخر سے یہ نہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے خطِ غلامی نہیں لکھا۔ مرحوم سے یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ:

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

جنگ کے زمانے میں دِلّی میں ادیبوں کی اچھی خاصی کھیپ آ گئی تھی۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) ریڈیو میں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے اپنے گِرد ادیبوں کا خاصہ بڑا حلقہ قائم کر لیا تھا۔ ن، م، راشد، شوکت تھانوی، انصار ناصری، عشرت رحمانی، غلام عباس، محمود نظامی، بہزاد لکھنوی تو جنگ سے پہلے ہی ریڈیو میں آ چکے تھے۔ جنگ کے زمانے میں چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، منٹو، میرا جی، اوپیندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، حامد علی خاں اور کرشن چندر بھی ریڈیو میں آ گئے۔ فوجی دفتروں میں مجید ملک، تاثیر، فیض اور بدر آ گئے تھے۔ سونگ پبلسٹی میں حفیظ جالندھری تھے اور پولی ٹکنک میں حمید احمد خاں، پطرس کے اشارے پر ایک اونچے درجے کا ادبی حلقہ نئی دہلی میں بنایا گیا۔ اور اس کے جلسے کبھی پطرس کی کوٹھی پر اور کبھی تاثیر کے بنگلے پر ہونے لگے۔ مجھے بھی خبر نہیں کیوں یاد فرما لیا جاتا تھا۔ پطرس اگر واقعی دِل سے کسی کی عزت کرتے تھے تو وہ پروفیسر مرزا محمد سعید تھے جن سے انھوں نے ایک زمانے میں پڑھا تھا۔ ان کی بے اندازہ علمیت کے پطرس قائل تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حلقے کے پہلے جلسے میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ محمود نظامی نے "اُردو شاعری میں عورت" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور کوئی بات ایسی نکلی کہ اس پر پطرس نے مرزا صاحب کو متوجہ کیا۔ مرزا صاحب دو چار لفظ بول کر خاموش ہو گئے۔ پطرس نے فیض صاحب کو اشارہ کیا اور خبر نہیں کہ انھوں نے دانستہ یا نادانستہ آغازِ کلام اس فقرے سے کیا کہ "یہ تو مرزا صاحب آپ جانتے ہی ہیں کہ یونان کی تہذیب روما کی تہذیب سے قدیم تر ہے۔" اتنا سُننا تھا کہ مرزا صاحب کو جلال آ گیا۔ چمک کر بولے: "جی ہاں، میں جانتا ہُوں اور اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔" اور پھر جو ان کے علم کے سمندر میں طوفان آیا ہے، تو انھوں نے آدھ گھنٹے میں قدیم تاریخ کو کھنگال کر رکھ دیا۔ بخاری صاحب زیرِ لب مُسکرا مُسکرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھتے رہے، جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پطرس نے چپکے سے میز پر چائے کا سامان لگوایا اور مرزا صاحب کا لکچر ختم ہوتے ہی اعلان

dasarulkutub.blogspot.com

کہہ دیا کہ "آپ کے حضرات چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" فیض صاحب کی طرح ہم سب کو بھی مرزا صاحب کی تقریر میں مزا آگیا۔ اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پطرس جو عزت مرزا صاحب کی کرتے ہیں، واقعی مرزا صاحب اس کے مستحق ہیں۔ اس ایک جلسے کے بعد مرزا صاحب پھر کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان جلسوں میں فیض صاحب کا کلام اکثر سننے میں آجاتا تھا۔

ایک دفعہ دلی کے ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت پطرس نے کی تھی۔ اس میں فیض صاحب نے "برفاب سے جسم" والی نظم سنائی تھی۔ ایک صاحب جو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ "برف سے جسم تو ہوتے تھے، یہ برفاب سے جسم کیا ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جو برف جیسے نہیں بلکہ برف کے پانی جیسے ہوتے ہیں۔" "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" میں نے انھیں اور جلانے کے لیے کہا۔ "بات تو ہوئی۔ جو لطف برفابی میں ہے وہ برف میں کہاں۔ ستر سال پہلے غالب بھی تو کہہ گئے ہیں! 'خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟' کوئی تو بات ہے جو انھوں نے برف نہیں باندھا، برفاب باندھ گئے۔" ناراض ہو کر منھ پھیر لیا۔

جنگ ہی کا زمانہ تھا کہ کرشن چندر ایک شام کو کتب خانۂ علم و ادب پر اردو بازار میں آئے۔ یہاں مغرب اور عشا کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ جامع مسجد میں جب عشا کی اذانیں ہونے لگیں تو ہم سب اپنے اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرشن چندر مجھے باتوں میں لگا کر ایڈورڈ پارک لے گئے اور بہت پس و پیش کے بعد بولے کہ "میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے شائع کریں گے؟" میں نے کہا۔ "ضرور شائع کروں گا۔" بولے۔ "تو کیا ممکن ہے کہ آپ مجھے اس کی قیمت ایک ہزار پیشگی دے دیں؟" میں نے کہا۔ "روپیہ کب چاہیے؟" بولے۔ "جب آپ دے سکیں۔ میں کشمیر جا کر ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔" اور واقع میں جب ایک مہینے بعد وہ کشمیر سے واپس آئے تو انھوں نے میرے گھر آکر "شکست" کا مسودہ میرے حوالے کر دیا۔ ڈھائی مہینے بعد یہ ناول شائع ہو گیا اور اس کی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر تنقید لکھی۔ الٹا اثر ہوا کہ ناول کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب جسے دیکھیے وہ

کہہ رہا ہے کہ میں بھی ناول لکھوں گا۔ اشک نے کہا۔ "میں نے بھی ناول لکھنا شروع کر دیا ہے، مگر میں پندرہ سو لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر شکست سے بہتر لکھو گے تو پندرہ سو ہی دوں گا۔" مگر وہ ناول نہیں لکھا گیا۔ عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" لکھنا شروع کر دیا۔ منٹو نے ایک ناول دھر گھسیٹا، اور خود ہی اسے ناپسند بھی کر دیا۔ سنا کہ ڈاکٹر تاثیر ناول لکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ ان سے مل کر دریافت کیا تو کہنے لگے کہ "ارادہ تو ہے مگر آپ فیض سے لکھوائیے۔" فیض صاحب سے ان کے فوجی دفتر میں ملا، بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بولے۔ "چھ سو پیشگی دے دیجیے۔" میں نے چیک وہیں کے وہیں حوالے کیا۔ حسرت صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے۔ "مولانا یہ آپ نے کیا ناول شائع کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ لکھیے نا۔" بولے۔ "دو سو روپے پیشگی دے جائیے۔" ان کی خدمت میں بھی چیک پیش کر دیا۔ دو تین مہینے بعد فیض صاحب نے روپیہ واپس کر دیا کہ ناول نہیں لکھا گیا۔ حسرت صاحب نے نہ ناول دیا نہ روپے واپس کیے۔ بلکہ ان روپیوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہیں کیا، اور میں نے بھی انھیں اس خوف سے یاد دلانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ سچ مچ ناول لکھ ہی نہ دیں۔ فیض صاحب کی تنہا مثال ہے کہ انھوں نے روپیہ واپس کر دیا۔ ورنہ کم و بیش پندرہ ہزار روپیہ ان پیشگیوں میں ڈوبا۔ اور پاکستان آنے کے بعد تو میں نے پبلشنگ کے کام ہی سے توبہ کر لی۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

فوجی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فیض صاحب "امروز" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ چراغ حسن حسرت بھی اسی دفتر میں آگئے تھے۔ ان حضرات نے اس اخبار کو چار چاند لگا دیے۔ عام اخباروں سے اس کی تنظیم مختلف تھی۔ خبروں کے علاوہ اس کا ادبی حصہ بھی بڑا جاندار ہوتا تھا۔ یہ اخبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اردو کے سب اخباروں سے بازی لے گیا۔ انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی تھے۔ اردو کے مضامین تو فیض صاحب کے لکھے ہوئے شاذ ہی دیکھنے میں آئے۔ البتہ انگریزی کے مضامین کئی دفعہ دیکھنے میں آئے۔ بہت سلجھے ہوئے اور پرمغز ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ فیض صاحب نے نثر لکھنے کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ اور اپنی تمام اعلیٰ قابلیت کے باوجود اب تک

qasarulkutub.blogspot.com

کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کرسکے۔ اور مجھے انجیل مقدس کا وہ قصہ یاد آجاتا ہے کہ ایک آقا
جب سفر پر جانے لگا تو اپنے تین غلاموں کو ایک ایک سونے کا سکہ دے گیا۔ ایک غلام نے
اُسے خرچ کر ڈالا۔ دُوسرے نے اسے زمین میں گاڑ کر دیا اور تیسرے نے اسے کاروبار میں
لگا دیا۔ آقا نے سفر سے واپس آکر پوچھا کہ تم نے سکے کا کیا کیا؟ پہلے غلام نے کہا" میں نے
اسے خرچ کر دیا" آقا اُس پر بہت بگڑا اور اسے سزا دی۔ دُوسرے نے کہا۔" میں نے
اسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ یہ لیجیے یہ موجود ہے۔" آقا اُس سے بھی ناخوش ہوا اور بولا کہ "تم
نے اسے ضائع نہیں کیا مگر تم نے اس سے فائدہ بھی نہیں اُٹھایا۔ یہ تم نے بہت بُرا کیا؟"
تیسرے نے سکہ بھی پیش کر دیا اور وہ منافع بھی، جو کاروبار میں اسے لگانے سے حاصل ہوا
تھا۔ آقا اُس سے بہت خوش ہوا۔ اُس کی ستائش کی اور اسے انعام بھی دیا۔ کاش فیض
صاحب بھی اپنے ٹیلنٹ کو بروئے کار لاتے اور دُوسروں کو اُس سے مستفیض ہونے کا موقع
دیتے۔ سنا ہے کہ ان کا ایک چھوٹا سا مجموعہ چند مضامین کا کبھی شائع ہُوا تھا۔ اب تو وہ کہیں
دیکھنے میں نہیں آتا۔ اور اکثر لوگوں کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز
کی ادارت بھی فیض صاحب ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک بڑا شاندار ہفتہ وار
پرچہ "لیل و نہار" بھی امروز اور پاکستان ٹائمز کے ادارے سے شائع ہونا شروع ہُوا تھا۔
اس کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی مقرر کیے گئے تھے مگر ان کا نام شاید برائے نام ہی دے
دیا گیا تھا۔ لیل و نہار میں نہ تو فیض صاحب بالالتزام کچھ لکھتے تھے اور نہ انھیں اس پرچے کے
دفتر میں کبھی کام کرتے دیکھا۔ ایک اور معروف ادیب و صحافی تھے سبطِ حسن، جو اُس
پرچے کا سارا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سبطِ حسن کو علیحدہ کر دیا گیا، شاید اس وجہ سے کہ
وہ کمیونسٹ مشہور ہو گئے تھے۔ "لیل و نہار" جس تیزی سے بڑھا تھا، ان کی علیحدگی کے
بعد اسی تیزی سے گرنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر صُوفی تبسم نے اسے بہت سنبھالنے کی کوشش
کی مگر ان کا وقفۂ ادارت "لیل و نہار" کا سنبھالا ہی ثابت ہُوا، اور ایک لائقِ فخر
ہفتہ وار جریدہ موت کی آغوش میں جا سویا۔

فیض صاحب بھی کمیونسٹ مشہور ہو گئے تھے مگر ان کی تخریبی سرگرمیاں کبھی دیکھنے

میں نہیں آئیں۔ وہ تو ایک خاموش اور مرنجانِ مرنج قسم کے آدمی تھے اور ہیں۔ کمیونسٹ ہونے
کا کلنک کا ٹیکہ اگر ایک دفعہ کسی کو لگ جائے تو شاید پھر ساری عمر چھڑائے نہیں چھوٹتا۔ غالباً
اسی "داغِ بدنامی" کی وجہ سے فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" سے، احمد ندیم قاسمی "امروز" سے اور
سبطِ حسن "لیل و نہار" سے علیحدہ کر دیے گئے۔

جب راولپنڈی کانسپریسی کیس میں بعض بڑے فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب
بھی گرفتار کر لیے گئے تو میری طرح بے شمار لوگوں کو تعجب ہُوا کہ یہ شریف آدمی اس زمرے میں
کیسے آگیا؟ یہ کوئی بہت اُونچے درجے کی سیاست ہے جسے معمولی عقل کے لوگ نہیں سمجھ
سکتے۔ لہٰذا ہم نے ع

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

کہہ کر صبر کر لیا۔ غالباً تین ساڑھے تین سال تک فیض صاحب قید و بند میں رہے۔ اُس زمانہ میں
اُن کی بیگم نے مردانہ وار ابتر حالات کا مقابلہ کیا۔ ملازمت کی اور اپنی بچیوں کے معیارِ زندگی
میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان کی تعلیم بھی جاری رہی اور ان کے اچھے خرچ بھی چلتے رہے۔ میں نے
بیگم فیض کو اخبار کے دفتر میں پسینے میں شرابور بہ نہایت انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھ میں
اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ان کے قریب جا کر انھیں اس حوصلے کی داد دیتا۔ دُور سے انھیں دیکھا
اور بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلا آیا۔ بارے یہ ابتلا کا دور بھی ختم ہو گیا اور فیض
صاحب بری ہو کر اپنے گھر آگئے۔ ان کے جیل میں رہنے کا ایک فائدہ فیض صاحب کو ہُوا ہو یا
نہ ہُوا ہو، ہمیں یہ ہُوا کہ ان کی منظومات کے دو مجموعے "زنداں نامہ" اور "دستِ صبا" ہمیں
مل گئے۔

بے روزگاری کے زمانے میں فیض صاحب نے ایک فلم کے مکالمے وغیرہ لکھے تھے اور
اس پر بین الاقوامی انعام ملا تھا۔ مگر فلم سازی اور فلم بازی سے کسی بھلے آدمی کو کیا سروکار؟
فیض صاحب دراصل تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ مگر کسی یونیورسٹی نے کوئی پیش کش نہیں کی۔
شاید اہلِ اختیار ان کے کلنک کے ٹیکے سے ڈرتے تھے۔ بارے جب لاہور میں آرٹس کاؤنسل کی
شاخ قائم ہُوئی تو فیض صاحب اس کے سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھیں لینن پرائز

qasarulkutub.blogspot.com

دینے کا اعلان رُوس نے کیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب پاسٹرناک کو اس کی کتاب ڈاکٹر ژیواگو پر نوبل پرائز دیے جانے کا اعلان ہُوا تھا اور حکومتِ رُوس نے اس بوڑھے مصنف کی آدرکنے سے بدتر کر دی تھی۔ اب اسی کمیونزم کے منبع سے فیض صاحب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا! سب نے دَم سادھ لیا کہ اللہ خیر کرے، دیکھیے اب کیا گُل کھِلتا ہے؟ مگر حکومتِ پاکستان نے اس غیر مُلکی اعزاز پر رُوس کی طرح تنگ دِلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شکر ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ثابت ہُوئے۔ جب فیض صاحب انعام لینے کے لیے رُوس جانے لگے تو کراچی ٹھہرتے ہوئے گئے۔ پاکستان رائٹرز گِلڈ نے آرٹس کونسل میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس جلسے کی صدارت کا فخر مجھے حاصل ہُوا۔ منجملہ اور باتوں کے مَیں نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنی حکومت سے شکوہ کیا کہ فیض صاحب کو اپنی حکومت سے اب تک کوئی انعام یا اعزاز نہیں ملا۔ اور سات سمندر پار کے ایک بہت بڑے مُلک نے انھیں اس کے اتنے بڑے انعام کا مستحق سمجھا۔ شاید ہمارے مُلک میں زندہ ادیبوں کی قدردانی کا دستور نہیں ہے جبھی تو پاکستان کا سب سے ہر دل عزیز شاعر محرومِ التفات ہے۔ مگر فیض صاحب نے قیامِ امن کے لیے جو جِدّوجُہد کی اس کا عِلم ہمیں نہ ہو سکا۔

جب فیض صاحب رُوس روانہ ہو گئے تو یہاں افواہ اڑنی شروع ہو گئی کہ واپس آتے ہی وہ گرفتار ہو جائیں گے لیکن ایسا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا اور فیض صاحب شاد و بامُراد واپس آ گئے۔

رُوس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد سُنا کہ فیض صاحب لندن چلے گئے ہیں اور پاکستانی کلچر پر مواد جمع کر کے کتاب لکھیں گے۔ طویل عرصے تک وہ لندن میں رہے اور یہاں واپس آ کر بھی انھیں خاصی مدّت گزر گئی مگر وہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شاید ان کی شاعرانہ سہل انگاری مانع ہے، یا شاید دیر آید درست آید۔

سال ڈیڑھ سال پہلے سُنا تھا کہ فیض صاحب کراچی یُونی ورسٹی میں انگریزی کے صدرِ شعبہ بنائے جا رہے ہیں۔ اس خبر سے خوشی ہُوئی تھی کہ یہ جگہ ان کے لیے موزوں بھی تھی اور خود یُونی ورسٹی کے لیے بھی لائقِ فخر، مگر پروفیسر احمد علی کی طرح فیض صاحب کو بھی اربابِ بست و کشاد نے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جوہرِ قابل ہوتے ہیں انھیں قدردان مل ہی جاتے ہیں۔ اب وہ ایک بہت بڑے مشاہرے پر ہارُون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ فیض صاحب تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے، پھر تعلیمی سلسلے ہی میں آ گئے۔ حق بہ حق دار رسید۔

۱۹۶۵ء

مولانا صلاح الدّین احمد

(۱)

بتیس تینتیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ مَیں ایک دفعہ لاہور گیا تو منصُور احمد مرحوم سے مِلنے کمرشل بلڈنگ، مال روڈ پر گیا۔ منصُور احمد اس وقت "ہمایُوں" کی ادارت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور مولانا تاجور نجیب آبادی سے "ادبی دُنیا" لے چکے تھے۔ "ہمایُوں" کی تمام تر ادارتی ذمہ داری مولانا حامد علی خاں نے سنبھال لی تھی۔ مولانا تاجور نے ۱۹۲۹ء میں بڑے سائز پر "ادبی دُنیا" شائع کر کے ادبی رسائل میں دُھوم مچا دی تھی۔ یہ زمانہ "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کے شباب کا زمانہ تھا۔ مگر "ادبی دُنیا" اس شان سے نکلا کہ ان جمے جمائے پرچوں کے چراغ جھلملانے لگے۔ "ادبی دُنیا" کے ادارے میں پہلا نام مولانا تاجور کا تھا اور دوسرا پنڈت میلا رام وفا کا (جو عُرفِ عام میں طوطا رام بے وفا کہلاتے تھے) مولانا تاجور "ادبی دُنیا" کے اجرا سے پہلے "مخزن" اور "ہمایُوں" کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ لہٰذا منجھے ہُوئے ایڈیٹر تھے اور ان کی دھاک بندھی ہُوئی تھی۔ "ادبی دُنیا" نکلا اور دو ایک چھلانگیں لگا کر سب سے آگے نکل گیا۔ مگر جو بہت تیز دوڑتے ہیں، وہ ہانپ بھی جلدی جاتے ہیں۔ "ادبی دُنیا" کے عروج کا زمانہ طُول نہ پکڑ سکا۔ مولانا تاجور ایک مقامی کالج میں پڑھاتے تھے۔ اور ایک بہت بڑے تاجرِ کُتب عطر چند کپور کے ہاں کتابیں لکھنے اور لکھوانے کا کام بھی کرتے تھے۔ "ادبی دُنیا" کا کام انھوں نے میلا رام وفا اور دو ایک ادھ کچرے ادیبوں پر چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ پرچہ گرنے لگا تو تاجور صاحب نے

qasaerulkutub.blogspot.com

منصور احمد سے اس کا سودا کر لیا۔ منصور احمد مرحوم صرف ایڈیٹر ہی نہیں تھے، ادیب بھی تھے۔ اور اچھی شہرت کے ادیب تھے۔ انھوں نے "ادبی دنیا" کی ڈوبتی ناؤ کو پھر تیرا دیا بلکہ پرچے کی سنجیدگی اور بردباری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میری مرحوم سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ وہ عالی پان سے خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ یہیں ایک اور صاحب کو بھی دیکھا جو منصور احمد کے دوست اور رفیقِ کار تھے۔ ان کا نام صلاح الدین احمد تھا۔ یہ صاحب ایک اور پرچہ بھی نکالتے تھے، یاد نہیں رہا اس کا کیا نام تھا۔ نام اس کا بھی دنیا ہی پر تھا۔ یہ پرچہ غیر معروف، ایڈیٹر غیر معروف۔ اس لیے علیک سلیک کے علاوہ ان سے اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ بات منصور احمد سے بھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ مگر اس مختصر ملاقات نے بھی منصور احمد کے لیے میرے دل میں جگہ بنا دی۔ اور کچھ ہی دنوں میں مجھے اُن سے اس درجہ شیفتگی ہو گئی کہ میں نے اُن کے نام پر اپنے ایک بچے کا نام منصور احمد رکھا۔ انھوں نے "ادبی دنیا" کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ مگر انھیں زمانے کی نظر لگ گئی اور یہ منحوس خبر سُننے میں آئی کہ منصور احمد کو دِق ہو گئی۔ اس زمانے میں اس مُوذی مرض کا کوئی علاج نہیں تھا۔ منصور احمد گھُل گھُل کر مر گئے۔ اور "ادبی دنیا" بھی ان کے ساتھ دم توڑنے لگا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرا لڑکا منصور احمد بھی ایک سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پھر سُنا کہ اشتہارات کی ایک کمپنی نے "ادبی دنیا" کو لے لیا، اور صلاح الدین احمد کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا ہے۔ پرچہ اسی آن بان سے شائع ہونے لگا۔

صلاح الدین احمد صاحب اس وقت تک بالکل گم نام تھے۔ مگر ان کا سلیقہ، پرچے کی ترتیب و تہذیب سے ٹپکتا تھا۔ انھوں نے اپنی مدد کے لیے میرا جی کو شریکِ ادارت کر لیا تھا۔ کچھ تو اپنے عجیب و غریب نام کی وجہ سے اور کچھ اپنی عجیب تر منظومات کے باعث میرا جی شہرت کے پر لگا کر اُڑنے لگے۔ صلاح الدین احمد حصّۂ نثر کی نگرانی کرتے تھے اور میرا جی حصّۂ نظم کی۔ میرا جی پھر بہت اچھی نثر بھی لکھنے لگے تھے، مگر صلاح الدین احمد صرف ادارتی نوٹ لکھتے تھے۔ سالہا سال تک انھوں نے کوئی مضمون نہیں لکھا۔

مجھے جو عقیدت "ادبی دنیا" سے تھی، وہ جاری رہی اور میں "ادبی دنیا" کے اشتہارات

"ساقی" میں شائع کرتا رہا۔ اور طلب کرنے پر بھی تبادلہ میں ساقی کا اشتہار نہیں بھیجا تھا۔ اور جب "ادبی دنیا" کے کسی خاص نمبر پر ریویو لکھتا یا اس کا تذکرہ کرتا تو اسے "اُردو کا سب سے بڑا رسالہ" کہتا تھا۔ پھر میں نے "ادبی دنیا" کے لیے مضامین بھی لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس دَور میں جو میں لاہور گیا تو "ادبی دنیا" کے دفتر بھی پہنچا۔ دفتر مال روڈ ہی پر اور آگے منتقل ہو گیا تھا۔ جب صلاح الدین احمد سے ملاقات ہوئی تو بڑی محبت سے گلے ملے اور ان کی گفتگو کا آغاز میری توصیف سے ہوا۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا اور صلاح الدین احمد صاحب مسکراتے اور ہنستے جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ "صاحب، آپ "ادبی دنیا" کے اشتہارات شائع کر دیتے ہیں اور یہیں اپنا اشتہار نہیں بھیجتے۔ آپ ہمارے لیے مضامین لکھتے ہیں اور معاوضہ نہیں لیتے عجیب بات ہے۔" یہ کہہ کر مختصر ہنسی ہنستے۔ میں ٹالنے کے لیے "چوں کہ چناں چہ" کی باتیں کرتا مگر وہ خندۂ دنداں نما کے ساتھ موضوع کو بدلنے نہ دیتے۔ دراصل اس زمانے میں لاہور سے ایک سے ایک بڑھ کر رسالہ شائع ہو رہا تھا۔ ہمایوں، نیرنگ خیال، عالمگیر، خیالستان، شاہکار — سبھی باون گزے تھے۔ جتنے یہ بڑے تھے، اتنی ہی ان میں بڑی رقابتیں تھیں۔

دُنیائے ادب میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں بنائی تھیں۔ ان ریاستوں میں باہمی خوش گواری نہیں تھی بلکہ تناتنی یا بے تعلقی رہتی تھی۔ ہر رسالے نے اپنے مضمون نگاروں کا ایک مخصوص حلقہ بنا رکھا تھا۔ ایک رسالے کے مضمون نگار عموماً دوسرے رسالے میں نہیں لکھتے تھے، یا شاید مدیروں نے اپنے مضمون نگاروں سے حلفِ وفاداری لے رکھا تھا کہ کسی اور پرچے میں نہیں لکھیں گے۔ چناں چہ سالک، امتیاز علی تاج، پطرس، تاثیر، ایم اسلم، قاضی عبدالغفار اور حفیظ جالندھری "نیرنگ خیال" ہی میں لکھا کرتے تھے۔ صلاح الدین احمد صاحب کی خوش مزاجی اور سلیقہ شعاری نے بھی اپنے گرد نئے اور اچھے ادیبوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ ان میں کرشن چندر، بیدی، عاشق بٹالوی، اوپندرناتھ اشک، حفیظ ہوشیار پوری اور حلقۂ اربابِ ذوق کے اُبھرتے ہوئے ادیب اور شاعر شریک تھے۔

"ہمایوں" کے لکھنے والوں میں تلک پیچا، نیرنگ، آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی اور فیاض محمود تھے۔ خود میاں بشیر احمد سوائے اپنے پرچے کے کسی اور پرچے میں نہیں لکھتے

qasrulkutub.blogspot.com

تھے۔ یوں لاہور چھوٹے چھوٹے ادبی جزیروں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک رسالے کا اشتہار بالعموم دوسرے رسالے میں نہیں چھاپا جاتا تھا اور نہ کسی تقریب میں دوسرے حلقے کے ادیبوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں جب "ساقی" نکلا تو بڑی جد و جہد اور کشمکش کے بعد اس نے ان سب حلقوں سے تعلقات استوار کیے۔ بے تعلقی کے حصاروں میں رخنے ڈالے۔ دوسرے پرچوں کے اشتہارات بھی شائع کیے اور بلا امتیاز ان پرچوں کے لیے مضامین بھی لکھے۔ اس روش پر صلاح الدین احمد کو بڑا اچنبھا ہوا اور راستے ہی میں وہ ٹوٹ کر ملے، اور اس ملاقات کے بعد حلقے اور حصار بھی رفتہ رفتہ ٹوٹ گئے۔

صلاح الدین احمد صاحب کی شخصیت بڑی من موہنی تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اور باتیں کرتے میں بھی مسکراتے جاتے تھے۔ دوہرے ڈیل ڈول کے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ بمبئی والوں کی سی کالی کرسٹی کیپ، ہنستی پیشانی، غلافی آنکھیں خوش دلی سے نیم وا، کتابی سی ناک۔ کترواں مونچھیں۔ لبوں پر خلوص کی مسکراہٹ۔ گول چہرہ۔ کھلتا ہوا رنگ۔ اچھا نکلتا ہوا قد۔ سوٹ پہنتے تھے۔ تھے تو گریجوایٹ، مگر انھیں انگریزی بولتے نہیں سنا۔ بلکہ گفتگو میں بھی کیا مجال جو کوئی انگریزی لفظ آ جائے۔ اردو کے عاشق تھے۔ اپنے رسالے میں برابر اعلان کرتے رہتے۔ اردو پڑھو۔ اردو لکھو۔ اردو بولو۔ یوں تو پنجاب کے سبھی ادیب اردو کے فدائی ہیں۔ اور زبان کے معاملے میں اہلِ زبان سے بھی الجھتے سلجھتے رہتے ہیں۔ مگر میں نے یہ تماشا بھی بہت دیکھا ہے کہ جب اردو کے دو پنجابی ادیب آپس میں ملتے ہیں، تو بلاتکلف اردو کو بالائے طاق رکھ کر فوراً پنجابی میں بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا، علامہ اقبال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ مگر ایک تو صلاح الدین احمد اور دوسرے حامد علی خاں، دو ادیب ایسے دیکھے جو پنجاب کے معزز خانوادوں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ اردو ہی بولا کرتے تھے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے گھروں میں بھی اردو ہی بولی جاتی تھی۔ جبھی تو ان کی زبان بھی چغلی نہیں کھاتی تھی، اور اہلِ زبان کی طرح فر فر اردو بولنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ مجھے ان کی خوش گفتاری پر رشک آنے لگتا تھا۔ لکھنے کو تو سیکڑوں اکتسابی زبان والے اچھی سے اچھی زبان لکھ لیتے ہیں، مگر بولنا ٹیڑھی کھیر ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد وضع قطع سے تو بالکل ایک اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین دکھائی دیتے تھے مگر کہلاتے "مولانا" تھے۔ سب انھیں مولانا کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے اور جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے بھی مولانا کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ میں نے دل میں کہا۔ "کوئی را ولی می شناسد، شاید میں بھی مولانا ہی ہوں۔" لہٰذا آخری ملاقات تک "من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" پر ہمارا عمل رہا۔ وہ مجھے مولانا کہتے رہے اور میں انھیں مولانا کہتا رہا۔

پہلی ملاقات کے دوسرے دن شام کو مولانا نے اپنے دفتر میں میرے اعزاز میں پرتکلف عصرانہ کا اہتمام کیا۔ اس میں اپنے تمام مقامی لکھنے والوں کو بلایا۔ اور سب سے مجھے متعارف کرایا۔ مولانا کے اس خلوص نے مجھے اور بھی ان کا گرویدہ کر دیا۔ اسی پارٹی میں کرشن چندر، بیدی، اشک، شیر محمد اختر، عاشق بٹالوی اور کئی اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے تعلقِ خاطر قائم ہوا۔ اس واقعہ سے میری تو عزت افزائی ہوئی ہی مگر مولانا کی وسیع القلبی بھی ظاہر ہوئی۔ ورنہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ رسالوں کے ایڈیٹر اپنے مخصوص لکھنے والوں سے بالمشافہ ہوانا تو کیسا، ان کے پتے تک نہیں بتاتے تھے۔

مولانا ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اگر کسی مضمون میں ذرا بھی فحش کا شائبہ ہوتا یا عریانی کی جھلک ہوتی تو اسے شائع نہ کرتے۔ اس وضع احتیاط میں پہلا نمبر "ہمایوں" کا تھا کہ بوسے کا لفظ "ہمایوں" میں نہیں چھپ سکتا تھا۔ مولانا اتنے متشدد تو نہیں تھے لیکن کچھ زیادہ ہی محتاط تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادیبوں کو کھل کھیلنے کی راہ سجھا دی تھی۔ "انگارے" کیا ضبط ہوئی کہ اس نے اور آگ لگا دی۔ اور اسی طرز کے افسانے لکھنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ جنسی معاملات کو تفصیل سے بیان کرنا ترقی پسندی کی علامت ٹھہری لہٰذا نئے لکھنے والے تو سب بہک کر ادھر ہی کو ڈھل گئے۔ بہت کم ادیب ایسے رہ گئے جنھوں نے سلامت روی کی چال نہیں چھوڑی۔ یہی وہ افراتفری کا زمانہ تھا کہ مولانا نے کرشن چندر اور بیدی جیسے ادیبوں کو دریافت کیا۔ اور ان سے مضامین لکھوا لکھوا کر انھیں بھاری بھرکم ادیب بنا دیا۔ مولانا سالہا سال تک "ادبی دنیا" شائع کرتے رہے۔

qasrulkutub.blogspot.com

مگر انھوں نے سوائے ادارتی نوٹوں کے نہ تو اپنے رسالے میں کوئی قابلِ ذکر مضمون لکھا اور نہ کسی اور رسالے میں۔ دو چار کتابوں کے پیش لفظ انھوں نے ضرور لکھے تھے، جن میں سے ایک اُن کے عزیز دوست عاشق بٹالوی کے افسانوں کے مجموعے "شاخسار" پر تھا اور ایک عصمت چغتائی کے افسانوں کے مجموعے "کلیاں" پر۔ انھی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر بھی گہری ہے اور عبارت بھی سلیس اور رواں لکھتے ہیں۔ مولانا اس وقت تک ادیب سے زیادہ ادیب گر تھے۔ پھر قیامِ پاکستان سے چند سال پہلے انھوں نے "کہنے کی باتیں" کے عنوان سے رسالوں کے بعض مضامین کے بارے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ گویا جدید ترین ادب کا جائزہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں آگے چل کر انھوں نے "ساقی" کے ایک مضمون پر کڑی تنقید کی، جو مجھے اس لیے ناگوار گزری کہ میں اتنا ثقہ مذاق نہیں رکھتا تھا جتنا کہ مولانا، یا میں اتنا محتاط نہیں تھا جتنے کہ مولانا۔ میں نے ساقی میں اس کا جواب لکھا اور شروع اس فقرے سے کیا کہ مولانا جو "کہنے کی باتیں" ہر مہینے لکھتے ہیں، وہ دراصل "نہ کہنے کی باتیں" ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں میں کسی قدر بدلحاظی بھی کر گیا تھا۔ مولانا بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ مجھے فوراً معذرت کا خط لکھا اور لکھا کہ آج سے یہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔ مجھے اپنی بدتمیزی پر افسوس ہُوا اور میں نے مولانا سے معافی چاہی۔ مگر "کہنے کی باتیں" پھر نہیں چھپیں۔ اور جب اس واقعہ کے بعد مولانا سے ملاقات ہُوئی تو ان کے طرزِ تپاک میں کوئی فرق میں نے محسوس نہیں کیا۔ "از خوردان خطا و از بزرگاں عطا"۔ مولانا مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ مجھ پر آخر تک شفقت فرماتے رہے۔

جب دلّی سے اُجڑ کر میں ستمبر ۴۷ء۱۹ کے تیسرے ہفتے میں لاہور پہنچا تو اپنی ادبی برادری والوں سے ملنے کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہُوا کہ مولانا کا گھر ہندوؤں کے محلّے میں تھا۔ جب اس محلّے میں آگ لگی تو ان کا گھر بھی جل گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مولانا کے لواحقین سب شملہ میں تھے ورنہ اس آتش زدگی میں خبر نہیں، اُن پر کیا گزرتی؟ مگر وہ سب کے سب شملے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ مولانا بے حد پریشان تھے۔ مگر اللہ نے بڑا فضل کیا کہ ان کے مال پر ٹلی۔ جانیں سب کی بچ گئیں۔ مکان جل گیا تھا۔ گھر والے شملے میں پھنسے ہُوئے تھے۔ "ادبی دُنیا" بند ہو گیا تھا، مگر مولانا کے اندازِ تکلّم میں مسکراہٹ اُس وقت بھی شامل تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مولانا کی حیثیت ایک اچھے ایڈیٹر اور صاحبِ نظر نقّاد کی تھی۔ ادیب یا مصنّف یا تو انھوں نے بننا نہیں چاہا یا شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ اس میدان میں جب آئیں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ وہ صفِ اوّل کے ایڈیٹر تھے، غالباً انھوں نے پسند نہیں کیا کہ تیسری یا دُوسری صف کے ادیبوں میں ان کا شمار ہو۔ کیوں کہ ایک دفعہ ساکھ بگڑ جانے کے بعد اس کا سنورنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو ادیب زیادہ لکھتا ہو وہ اچھا بھی لکھتا ہو۔ مولانا نے بڑی دانش مندی سے کام لیا کہ محض اپنا شوق پُورا کرنے کے لیے یا حصُولِ شہرت کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ اور جب وہ اس میدان میں آئے تو اس شان کے ساتھ کہ سب سے بازی لے گئے۔ اُس وقت وہ پچاس کے پیٹے میں آ چکے تھے۔ گویا ان کے شیب سے ان کے قلم کا شباب شروع ہُوا۔ مگر جس منزل تک پہنچنے کے لیے ادیب ساری ساری عمر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور پھر بھی نہیں پہنچ پاتے، مولانا نے ایک ہی جست میں اس منزل کو جا لیا۔

اب جو مولانا ہمارے سامنے آئے تو ان کا رنگ رُوپ ہی بدلا ہُوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نہایت حسین و دل نشین طرزِ بیان لائے تھے۔ اس اندازِ گُل فشانی پر شمس العلما محمد حسین آزاد کا سایہ تھا۔ مولانا کو پروفیسر آزاد کی تحریروں سے والہانہ شیفتگی تھی۔ اور ہونی بھی چاہیے تھی، کیوں کہ آج بھی اُردو کے سب سے بڑے انشا پرداز آزاد ہی ہیں۔ مگر آزاد کی مرصّع کاری کی پیروی کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ اِس صدی میں تو کسی کو حوصلہ ہُوا نہیں۔ آزاد کی برسی ہر سال اُن کے پوتے آغا محمد باقر لاہور میں مناتے ہیں اور ہر برسی میں، مولانا صلاح الدین احمد، آزاد سے کسی نہ کسی پہلو پر آزاد ہی کے انداز میں مضمون لکھ کر سناتے رہے ہیں۔ یُوں آزاد کا طرزِ تحریر مولانا کے خون میں رچ گیا اور اس میں مولانا نے اپنے قلب و نظر کی خاص و دیعتیں شامل کر کے اپنا ایک خوش رنگ و خوش آہنگ اسلوب مرتّب کر لیا۔ اس ضمن میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے آنکھوں سے لگانے اور دل میں سمانے کے لائق ہے۔

اب سے کوئی دس سال پہلے پاکستان کے ادبی رسائل کی بے قدری و زبوں حالی کے پیشِ نظر جب مولانا رازق الخیری اور میں نے مل کر انجمن ادبی رسائل پاکستان کی داغ بیل ڈالی تو

qesarulkutub.blogspot.com

پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو ہم نے انجمن کا ممبر بنا لیا اور سب نے رکنیت اس لیے فوراً قبول کر لی کہ ہم سب کے مسائل ایک سے تھے۔ مگر مولانا صلاح الدین احمد نے رضامندی ظاہر نہیں کی۔ اس پر ہمیں تعجب بھی ہوا۔ خیر چند مہینے بعد انجمن کی مجلسِ عاملہ نے طے کیا کہ اس کا باقاعدہ افتتاحی جلسہ لاہور میں کیا جائے۔ لہٰذا ہم نے چندہ کیا اور بارہ ایڈیٹر لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ہمارے ٹھہرنے اور جلسے کا انتظام لاہور کے ادبی رسائل کے ایڈیٹروں نے کیا تھا۔ ان میں پیش پیش "نقوش" کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب تھے۔ شام کو مہمان اور میزبان سب ایک جگہ جمع ہوئے اور جلسے کی تفصیلات طے کی گئیں۔

اگلے دن صبح ہی صبح میں اور مولانا رازق الخیری مولانا صلاح الدین احمد کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ کنڈی کھٹکھٹائی، جواب ندارد۔ پھر کھٹکھٹائی۔ دور سے آواز آئی۔ "ذرا ٹھہرو۔" ٹھہر گئے۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا تو صلاح الدین احمد صاحب گھبرائے ہوئے برآمد ہوئے اور ہمیں دیکھ کر اور بھی گھبرا گئے۔ ان کا سر اور دھڑ پانی میں تربتر تھا۔ صرف پاجامہ پہنے ازاربند باندھتے چلے آئے تھے۔ جھجک کر بولے۔ "آپ حضرات ہیں! میں سمجھا، دودھ والا ہے۔ معاف فرمایئے، ابھی حاضر ہوا۔" اور مولانا بغلی ڈوب کر غائب ہو گئے۔ ہم اپنی جگہ پر شرمندہ ہو رہے تھے کہ ایک شریف آدمی کے گھر صبح ہی صبح کیوں بے اطلاع جا دھمکے۔ اتنی دیر میں مولانا کرتا پہن کر آ گئے اور بولے۔ "آیئے، اندر تشریف لایئے۔" پہلو میں ایک کمرہ تھا، جس میں انھوں نے ہمیں بٹھایا اور ناشتہ کو پوچھا۔ ہم نے کہا۔ "ناشتہ سے ہم فارغ ہو چکے ہیں۔ آپ سے دو باتیں کرنی تھیں اس لیے حاضر ہو گئے۔" بولے۔ "فرمایئے۔" خیری صاحب نے کہا۔ "ایک تو یہ بتایئے کہ آپ انجمن کے ممبر کیوں نہیں بنے؟ اور دوسرے یہ کہ آپ ہمارے جلسے میں شریک کیوں نہیں ہو رہے؟" مولانا نے چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر کہا۔ "مولانا! میں کسی انجمن کا ممبر نہیں بنتا۔ ویسے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ دیکھیے میں نے جلسے کے لیے دو ریزولیوشن لکھے ہیں جو میرے ہی نام سے پیش کیے جائیں گے۔"

ہم نے مولانا سے مزید سوالات کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ مولانا بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے تھے۔ اور پھر اپنے فیصلے پر جم جاتے تھے۔ ہمیں جلسہ گاہ میں پہنچنا تھا،

اس لیے اس مختصر سی ملاقات کے بعد ہم نے مولانا سے اجازت چاہی۔

مولانا بہت ہی خوددار آدمی تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ جو انجمن بنی ہے، اس لیے بنی ہے کہ ادبی رسائل کے حقوق کے تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے کچھ سرکاری امداد ملنے لگے۔ اور جب اسے امداد ملنے لگے گی تو آگے چل کر اس میں جھگڑے بھی بہت پڑیں گے۔ مولانا دنگے فساد سے دور رہتے تھے۔ اپنی ۳۵ سالہ ادبی زندگی میں وہ ایک دفعہ بھی کسی سے نہیں الجھے۔ خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے تھے۔ سرکاری امداد قبول کرنے کے وہ سخت مخالف تھے۔ جب انھوں نے پنجاب اکیڈمی بنائی تو انھیں بڑی آسانی سے پچیس تیس ہزار روپے سالانہ کی سرکاری امداد مل سکتی تھی۔ مگر وہ اپنا گھر لٹاتے رہے اور انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی کسی سے بطور امداد قبول نہیں کیا۔ مولانا اپنے منصوبے خود بناتے تھے اور انھیں اپنی ہی مرضی سے پورا کرتے تھے۔ کسی طرف سے دخل درمعقولات وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ دو ایک سال ہوئے کہ انھوں نے ایک ادارے اردو فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی تھی اور بڑے پیمانے پر اردو مطبوعات کا کام کرنا چاہتے تھے۔ اور یقیناً وہ ان تمام اداروں سے کہیں زیادہ اور بہتر کام کرتے جنھیں لاکھوں روپے سالانہ کی امداد حکومت سے مل رہی تھی۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان نے حکومت سے سالانہ امداد حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ کیوں کہ اس انجمن کا کام صرف ادبی رسائل کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے اور اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اگر کچھ خرچ ہوتا بھی ہے تو اس کے اراکین خود ہی اخراجات کو پورا کر لیتے ہیں مگر مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط نے اس پر بھی انھیں رکنیت قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب دو سال پہلے انجمن کا سالانہ جلسہ لاہور میں ہوا تو اس کی ایک ادبی نشست میں، جس کی صدارت جسٹس جانؔ نے کی تھی، مولانا نے ایک نہایت پُرمغز اور دلآویز مضمون پڑھا تھا۔ یوں انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ ممبر نہ ہونے کے باوجود وہ ہمارے شریکِ کار رہے۔

انجمن کئی سال سے اس کوشش میں ہے کہ بعض ان مدیرانِ رسائل کے وظائف مقرر ہو جائیں جنھوں نے ساری عمر خدمتِ ادب میں گزار دی اور اب ان کی صحت بھی جواب دے رہی ہے اور مالی حالت بھی اچھی نہیں رہی ہے۔ جتنی بھی حکومتیں اب تک پاکستان میں

dasarulkutub.blogspot.com

برسرِ اقتدار آئیں اُن کے وُزرا اور وزارت کے سیکرٹریوں کی خدمت میں انجمن کے وفُود حاضر ہوکر محضر پیش کرتے رہے۔ مگر عجب اتفاق ہے جب کام بننے پر آیا تو حکوُمت بدل گئی۔ جن معمّر مدیروں کے لیے جدّوجہد کی جارہی ہے ان میں سے بلا استثنیٰ سبھی نے شرط لگائی ہے کہ یہ وظائف بطورِ خیرات قبول نہیں کیے جائیں گے، بلکہ انھیں اگر حسنِ خدمات کا صِلہ موسُوم کیا جائے گا تو قابلِ قبول ہوں گے۔ اور یہ بھی اس لیے کہ حکوُمت ہماری اپنی ہے، کسی غیر مُلک کی نہیں ہے۔ مگر وظائف کی فہرست میں جب مولانا کا نام شامل کرنے کی اجازت چاہی گئی تو وہ اس قدر گھبرائے اور برہم ہوئے جیسے اُن سے خطِ غلامی لکھوایا جارہا ہو۔ بولے۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرا نام ہرگز پیش نہ کریں۔ میں نے آج تک کسی قسم کی سرکاری امداد قبول نہیں کی ہے۔ مجھے معاف رکھا جائے۔"

میں تو مولانا کی طبیعت سے کسی قدر واقف تھا اس لیے ان کی برہمی پر متعجب نہیں ہُوا، مگر انجمن کے صدر مولانا رازق الخیری حیرت اور شرمندگی سے ان کا مُنھ تکنے لگے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا اس تجویز کو سُن کر خوش ہوجائیں گے۔ مگر وہاں اُلٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ قدری کرنی مگر مولانا قائل نہیں ہوئے، اور ہم اپنا سا مُنھ لے کر ان کے دفتر سے چلے آئے۔ مولانا رازق الخیری نے زینے سے اُترنے کے بعد خالص دِلّی والوں کے لہجے میں کہا "بس بھئی کہہ چکے؟" میں نے کہا ——— "جی ہاں! یہ طائرِ لاہوتی ہے۔"

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کے فدائی لاہور میں گنتی کے رہ گئے تھے، اُن میں سے بھی نئے حالات نے بہت سوں کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبُور کردیا تھا۔ ان شکست خوردہ ادیبوں میں سالک، مہر اور امتیاز علی تاج جیسے قدآور لوگ بھی شریک تھے۔ سالک اور مہر نے اخبار "انقلاب" بند کرکے کتابیں لکھنی شروع کردی تھیں۔ تاج صاحب "تہذیبِ نسواں" اور "پھُول" سے کنارہ کرکے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوگئے تھے، اور بعد میں کچھ اور سرکاری کاموں میں مبتلا ہوگئے۔ میاں بشیر احمد نے پے در پے کئی ایڈیٹر بدلے مگر "ہمایوں" کا معیار بھی گِرتا گیا اور اشاعت بھی، یہاں تک کہ مایُوس ہوکر انھوں نے "ہمایوں" بند کردیا۔

حامد علی خاں صاحب نے "الحمرا" جاری کیا تھا، بہت سارا نقصان بھرنے کے بعد بند کرنا پڑا۔ "نیرنگِ خیال" کے ایڈیٹر حکیم محمد یوُسف حسن صاحب اپنا پرچہ لاہور سے پنڈی لے گئے اور جب اس کے چلنے کی کوئی راہ نہ نِکلی تو اسے بند کرکے حِکمت کے ہو رہے۔ "عالمگیر" کے ایڈیٹر حافظ محمد عالم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے ساتھ ان کا پرچہ بھی مرگیا۔ اس مرامری میں بڑے بڑوں کے جی چھُوٹ رہے تھے مگر مولانا صلاح الدین احمد ڈٹے ہوئے تھے۔ جب بھی انھیں موقع مِلتا "ادبی دُنیا" کا ایک پرچہ چھاپ دیتے۔ یُوں کئی سال تک ان کا پرچہ گنڈے دار نکلتا رہا اور اسی افراتفری میں انھوں نے پنجاب اکیڈمی قائم کرکے کتابیں چھاپنی شروع کردیں۔

مولانا اپنے پُرانے رفیقِ کار "میرا جی" کی کتابیں چھاپنا چاہتے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بمبئی میں میرا جی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور مولانا ان کی یادگار اس طرح قائم کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اسے کتابی صورت میں محفوظ کردیں۔ دُوسرے یہ کہ میرا جی کے مرنے سے ان کی بیوہ نابینا والدہ مالی مشکلات میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ مولانا نے مجھے اس سلسلے میں خط لکھا کہ میرا جی کی کتابیں چھاپ کر اُن کی رائلٹی اُن کی والدہ کو دینا چاہتے ہیں۔ میرے پاس میرا جی کی چار کتابوں کے حقوقِ اشاعت تھے میں نے ان سے دست برداری لکھ کر مولانا کو بھیج دی۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور مجھے طویل خط شکریہ کا لکھا۔ میرا جی کے نثری مضامین کا انتخاب مولانا نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں چھاپ دیا تھا۔ افسوس کہ ان کے منظومات کے مجموعے شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔

یُوں تو مولانا لڑائی بھڑائی سے بہت دُور رہتے تھے اور کبھی کسی سے ان کی معاصرانہ چشمک نہیں ہوئی۔ مگر وہ تھے بڑے دبنگ آدمی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہُوا کہ صدر ایوّب نے جب پنجابی میں تقریر کی تو مولانا نے انھیں برملا ٹوک دیا کہ انھیں قومی زبان اُردو میں تقریر کرنی چاہیے تھی۔ اور اس پر بھی توجہ دلائی تھی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سے لفظِ اسلامی کیوں ساقط کیا گیا؟

صدر ایوّب مولانا کی اس جُراُت مندانہ تنقید سے ناخوش نہیں ہوئے جیسا کہ ان کے

qasarulkutub.blogspot.com

اس پیغام سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے مولانا کے انتقال پر دیا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ ہم میں سے کتنے ہمت رکھتے ہیں کہ صدرِ پاکستان کو اس بے باکی سے ٹوک دیں ؟

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں مولانا کے دل میں یہ سما گئی تھی کہ وہ ۶۳ سال کی عمر میں مر جائیں گے۔ اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ ابن انشا صاحب نے کراچی سے اپنے ادارے کا کچھ کام مولانا کو سال ڈیڑھ سال پہلے بھیجا تھا۔ مولانا نے کم فرصتی کا عذر کر کے کام لوٹا دیا تھا اور انشا صاحب کو بتایا کہ چوں کہ ان کے اب و جد ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کرتے رہے ہیں لہٰذا انھیں بھی ۶۳ سال کی عمر میں مر جانا ہے اور اس عمر کو پہنچنے میں کچھ زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا۔ یہ بات انشا صاحب نے مجھے بتائی تھی، اور جب میں پچھلے سال لاہور گیا تو حامد علی خاں صاحب سے برسبیلِ تذکرہ مولانا کے اس وہم کا بھی ذکر آیا۔ حامد صاحب نے فرمایا یہ واقعہ صحیح ہے، اِسی لیے وہ اپنے تمام کام جلدی جلدی سمیٹ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری پونجی اپنے ادارے " اردو فاؤنڈیشن" کے لیے وقف کر دی تھی۔ اور " ادبی دنیا" کو ایک نئے انداز سے نکالنا شروع کر دیا تھا۔ تین سو صفحے کا پرچہ اب اُنھوں نے ایک روپے میں دینا شروع کر دیا تھا۔ حالاں کہ اصولاً اس کی قیمت تین روپے ہونی چاہیے تھی۔ اخبار فروشوں کو کمیشن وغیرہ دینے کے بعد تو آنے کا پڑتا تھا۔ لہٰذا " ادبی دنیا" کی دھوم مچ گئی اور ہر اشاعت کے بعد اُس کی تعداد دُگنی ہوتی چلی گئی۔ یعنی نقصان بھی دو گنا ہوتا چلا گیا۔ ہم تو یہ کہتے تھے کہ یہ صریحاً خود کُشی ہے۔ مولانا نے موم بتّی کو دونوں سروں سے جلا دیا ہے۔ اور مولانا یہ سمجھتے تھے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ اسی صورت میں پرچہ خود کفیل ہو جائے گا۔ وہ فرماتے تھے کہ " میں اپنی اولاد کے فرائض سے سُبک دوش ہو چکا ہوں۔ میرا ایک مکان اور رہ گیا ہے، میں اُسے بھی بیچ کر اس تجربے میں لگا ڈالوں گا۔ ۶۳ سال کی حد اب قریب آ چکی ہے۔ اپنے سامنے ہی " ادبی دنیا" کی بنیادیں استوار کر دینا چاہتا ہوں"۔ اور اگر مولانا

کو موت فرصت دیتی تو یقیناً وہ اپنے تجربے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ مگر ۶۳ سال پورے ہو گئے اور مولانا کا اندیشہ پورا ہُوا۔

۱۰ ارجون کو " نقوش" کی سویں اشاعت " آپ بیتی نمبر" کی تقریب میں جب میں اپنا مضمون پڑھ رہا تھا تو اچانک میری نظر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ سامعین کی دُوسری صف میں مولانا بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جب اپنا مضمون ختم کر کے واپس آیا تو میری جگہ پر کوئی مہربان بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے تقریباً سب سے پیچھے جا کر بیٹھنا پڑا۔ وہاں سے پھر میں نے مولانا کو دیکھا۔ بالکل ویسے ہی تھے جیسے تیس سال پہلے تھے۔ صرف مونچھیں کھچڑی ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ جلسہ ختم ہو گا تو میں مولانا سے لپٹ جاؤں گا۔ مجھے ان سے ملے دس سال ہو گئے تھے۔ مگر جب جلسہ ختم ہُوا تو اس جلسے کے منتظم عشرت رحمانی صاحب نے مجھے لے جا کر وزیرِ تعلیم مغربی پاکستان کے پاس بٹھا دیا۔ اور جب میں وہاں سے اُٹھا تو مولانا جا چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ کل دفتر جا کر مولانا سے مِل لوں گا۔ مگر اگلے دن میں کچھ اور کاموں میں پھنس گیا، اور شام کی گاڑی سے کراچی واپس روانہ ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی مولانا کا آخری دیدار ہے۔ اس کے چوتھے دن ریڈیو نے یہ منحوس خبر سُنائی کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔

(۲)

بعض پیارے جو ہم سے رخصت ہو چکے ہیں، جب ان کا خیال آتا ہے تو دھیان میں دھنک سی نکل آتی ہے، کسی کسی کا تصور بندھتا ہے تو خوشبو سے مشامِ جاں معطر ہو جاتا ہے، کبھی کلیاں چٹکنے لگتی ہیں، کبھی پھول کھِلنے لگتے ہیں۔ مگر مولانا صلاح الدین احمد یاد آتے ہیں تو ذہن کے اُفق پر چاند کھیت کرتا ہے اور ٹھنڈی چاندنی چھِٹکتی چلی جاتی ہے۔ اپنی زندگی میں مولانا چودھویں کا چاند بن کر ادب کے آسمان پر چمکے اور مرتے مرتے اپنے پیچھے ایک ایسی کہکشاں چھوڑ گئے جو اُن کے نام کو رہتی دُنیا تک پائندہ و تابندہ رکھے گی۔

مولانا کو بچپن ہی سے ادب کی چیٹک تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو اپنے جیب خرچ میں سے پیسے بچا کر انھوں نے ایک رسالہ نکالا تھا جس میں خود لکھتے تھے اور اپنے اسکول

qasrulkutub.blogspot.com

کے دوستوں سے لکھوا تے تھے۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو رسالہ بھی بند ہو گیا۔ مگر اَدب کی لگن باقی رہی اور اس دلی ہوئی خواہش کی تکمیل اُس وقت ہوئی، جب کئی سال بعد مولانا تاجوَر نجیب آبادی سے انھوں نے "اَدبی دُنیا" کو خرید لیا۔

مولانا ایک آسُودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ یہ خاندان زوالِ دِلّی کے زمانے میں دِلّی چھوڑ کر لاہور آ گیا تھا۔ مولانا کے والد مولوی احمد بخش عربی، فارسی اور اُردو کے بہُت بڑے عالم اور رجیفس کالج میں فارسی کے اُستاد تھے۔ مشرقی زبانوں سے انھیں بچپن ہی میں شیفتگی ہو گئی تھی۔ اور خاندان کے پنجاب منتقل ہو جانے کے باوجود اُن کے گھر میں اُردو ہی بولی جاتی تھی۔ اس خاندان کے افراد ملازمت پیشہ تھے اور انگریزوں کی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ مولانا کے بڑے بھائی ضیاءالدّین احمد جو مولانا سے کئی سال بڑے تھے۔ سندھ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ مولانا بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد پولیس سروس میں آ جائیں۔ مگر مولانا ملازمت کے بندھنوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اسی میں اللّٰہ تعالیٰ نے اچھی خاصی برکت دے دی تھی۔ مگر جس کو ادَب کی چاٹ لگ جائے، وہ کِسی اور کام کا نہیں رہتا۔ چناں چہ جب "اَدبی دُنیا"، کو مولانا تاجوَر نے بند کرنے کا ارادہ کر لیا تو مولانا مرحُوم نے اُسے خرید لیا۔

لاہور ہی میں ایک اور صاحب تھے منصُور احمد۔ یہ صاحب مولانا کے پُرانے ہم جماعت اور دوست تھے۔ ان کا تعلق مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تھا۔ انھیں بھی ادب کا چسکا شروع ہی سے تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد "ہمایوں" کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ کئی سال تک "ہمایوں" کو چلانے کے بعد خرابیٔ صحت کی بنا پر "ہمایوں" کی ادارت حامد علی خاں صاحب کو سونپ کر علیحدہ ہو گئے۔ منصوَر احمد تجربہ کار اور نیک نام ایڈیٹر تھے۔ صلاح الدّین احمد صاحب نے اپنے رفیقِ دیرینہ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ "اَدبی دُنیا" کا بارِ ادارت اٹھانے میں ان کے شریک ہو جائیں۔ صلاح الدّین احمد کو اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا۔ منصوُر احمد کو سب جانتے تھے، اُن کی ساکھ بھی تھی۔ اس سے "اَدبی دُنیا"، کو دوبارہ جمانے میں بڑی مدد ملی۔ صلاح الدّین احمد صاحب اچھے منتظم بھی تھے۔ رسالے کا کام اُنھوں نے بہت باقاعدگی

سے شروع کیا۔ منصُور احمد نے پرچے کی ترتیب اپنے ذمّے لے لی۔ ان کے چھوٹے بھائی مظفّر احمد نے حساب کتاب سنبھالا۔ ایف ایم ستّاقی نے اشتہارات مہیّا کرنے کا ذمّہ لیا۔ مولانا تاجوَر کے زمانے میں بھی شعبۂ اشتہارات اُنھی کے سپُرد تھا۔ صلاح الدّین احمد صاحب نے انتظامیہ شعبہ بھی سنبھالا، اور ادارت میں بھی ہاتھ بٹایا۔ دفتر کے مختلف کام کرنے کے لیے چار اور آدمی رکھے گئے۔ مال روڈ پر دفتر آ گیا۔ پرچہ بڑے طمطراق سے نکلنے لگا اور چند مہینوں ہی میں اپنے ہم عصر رسالوں میں مقام پیدا کر لیا۔ "اَدبی دُنیا" سائز میں تمام ادبی پرچوں سے بڑا تھا۔ اور اس کی ظاہری وضع قطع بھی بہت خوش نما تھی۔ نئے لکھنے والے ادبا اس کے لیے مضامین بھیجتے تھے اور اس میں چھپ جانا اپنے لیے قابلِ فخر بات سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ تقریباً سارے ہی اچھے لکھنے والے "اَدبی دُنیا" میں جمع ہو گئے۔ اس کھیپ میں میراَجی بھی آئے، کرشن چندر، بیدی اور اشک بھی۔ انھیں "اَدبی دُنیا" سے شہرت ملی اور "اَدبی دُنیا" کو ان سے فروغ ملا۔ مولانا صلاح الدّین احمد کی مقناطیسی شخصیت نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اور اچھے لکھنے والوں کا ایک حلقہ "اَدبی دُنیا" کو مِل گیا۔ مولانا ان نئے لکھنے والوں کو ہمیشہ جتاتے رہتے تھے کہ اَدب میں پاکیزگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ اور اخلاقی قدروں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ مولانا نے انھیں یہ بھی بتایا کہ اچھی چیزیں لکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے، کہ کلاسیکی ادب سے اپنا ناتا نہ توڑا جائے۔ اکثر ایسا بھی ہُوا کہ بعض بہت اچھے مضامین محض اس لیے "اَدبی دُنیا" میں جگہ نہ پا سکے کہ ان میں فحاشی یا عریانی کا جُزو شامل تھا۔ مولانا اس معاملے میں بہت سخت گیر تھے۔ خوش اسلوبی سے مضامین لوٹا دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ منٹو کا کوئی مضمون "اَدبی دُنیا" میں کبھی چھپا ہو۔

منصوَر احمد کے مَرض نے دِق کی صورت اختیار کر لی اور بہت تھوڑے عرصے بعد ہی اللّٰہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وقت صلاح الدّین احمد صاحب کے لیے بڑا آزمائش کا تھا۔ مگر وہ محنتی آدمی تھے، اس صدمے کو جھیل گئے اور منصوُر احمد کی کمی انھوں نے محسُوس نہیں ہونے دیا۔ چناں چہ "اَدبی دُنیا" اُسی شان سے نِکلتا رہا۔

میراَجی نے اپنے زمانۂ ملازمت میں دُوسری زبانوں کے مشہُور شعرا پر بہت کام کے

qasatulkutub.blogspot.com

مضامین لکھے۔ بودلیئر ان کا محبوب و مثالی شاعر تھا۔ اس کی شخصیت کا زیادہ حصہ میراجی نے اپنے کردار میں سمو لیا تھا۔ جب محمود نظامی نے میراجی کو آل انڈیا ریڈیو میں دلی بلوا لیا تو مولانا تنہا ادارتی فرائض انجام دینے لگے۔

مولانا بے حد شریف النفس انسان تھے۔ رسالے والوں کی برادری میں اکثر آپس میں جھڑپیں ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر "ادبی دنیا" کبھی کسی لڑائی بھڑائی میں مبتلا نہ ہوا۔ حالاں کہ لاہور اس زمانے میں ادبی جدال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اپنے "افکار و حوادث" میں یوپی والوں سے الجھتے سلجھتے رہتے تھے۔ حفیظ جالندھری اور مولانا تاجور کی چلتی رہتی تھی۔ نیاز مندانِ لاہور نے اپنا محاذ بنا رکھا تھا۔ لیکن مولانا ان سب مناقشوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان سب سے الگ رہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ لہٰذا وہ اپنے سب معاصرین سے بازی لے گئے۔ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رسائل کے جائزے کے سلسلے میں مولانا نے "ساقی" کے کسی مضمون پر کچھ لکھ دیا تھا۔ مجھے مولانا کا یہ تھوڑا سا لکھنا بھی بہت برا لگا تھا۔ اور میں نے جواب میں کچھ باتیں ایسی لکھ دی تھیں جو گستاخی کی حد کو پہنچ گئی تھیں۔ مولانا نے یہ کیا کہ "ادبی دنیا" میں سے یہ سلسلہ ہی اڑا دیا۔ اور مجھے اس کے منقطع کرنے کی اطلاع دی۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور میں نے فوراً معذرت کا خط لکھا، مگر مولانا نے وہ سلسلہ دوبارہ جاری نہیں کیا۔ اتنا صلح کل مدیر میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ تحمل اور بردباری مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نئے مضمون نگار ان کے دفتر میں پہنچ کر انھیں بہت ستاتے تھے۔ بعض بحث کرنے لگتے تھے، مگر مولانا کی تیوری پر بل تک نہ آتا تھا۔ بڑی نرمی اور خوش اسلوبی سے ان کے مضامین کے نقائص انھیں سمجھا دیتے تھے، اور انھیں مطمئن کر کے رخصت کرتے تھے۔ بڑے دل گردے کا کام ہے یہ۔ اپنی تو کیفیت یہ تھی کہ بحث کسی سے نہیں کی۔ بس کہہ دیا کہ مضمون ٹھیک نہیں ہے، نہیں چھپ سکتا۔ اور اگر کسی نے بحث کی تو اسے چیراندی باتیں کر کے بھگا دیا۔

کوئی تیس سال پہلے مولانا سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو ٹوٹ کر گلے ملے۔ کہلاتے مولانا تھے مگر نکلے اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین۔ پورا سوٹ مع نکٹائی کے زیب تن تھا۔ سرو قد،

کھلی پیشانی، غلافی آنکھیں، ستواں سی ناک، کترواں مونچھیں، منڈی ہوئی ڈاڑھی، لبوں پہ مسکراہٹ، چہرے پہ ذہانت کا نور۔ بڑی دل کش شخصیت تھی مولانا کی۔ اس پر ان کا حسنِ اخلاق سونے پہ سہاگہ۔ مجھ سے پانچ چھ سال بڑے تھے، مگر پہلی ملاقات میں ہم عمروں کی طرح گھل مل گئے۔ مولانا کی وضع مغربی تھی مگر ان کا دل خالصتاً مشرقی تھا۔ بہت خوش ہوئے اور بہت خوش کیا۔ اگلے دن شام کو دفتر ہی میں چائے پر بلایا تو "ادبی دنیا" کے تقریباً سبھی مقامی مضمون نگار موجود تھے۔ اکثر سے ملاقات پہلے ہو چکی تھی۔ کرشن چندر، بیدی، اشک، عاشق بٹالوی، اور دیوندر ستیارتھی سے یہیں تعارف ہوا۔ اس واقعہ سے بھی مولانا کی وسیع القلبی کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ ہماری برادری میں اپنے مخصوص مضمون نگاروں سے ملانا تو کیسا، ان کے پتے تک دوسرے ایڈیٹروں کو نہیں بتائے جاتے۔

مولانا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور کے متعلق ہندوؤں کا خیال تھا کہ لاہور ہندوستان میں آئے گا۔ اس لیے ہندو لاہور میں جمع رہے۔ خنجر زنی کی وارداتوں کے بعد آتش زنی کے واقعات ہونے لگے۔ ان ہی میں مولانا کا گھر بھی جل گیا۔ میں جب دلی سے اجڑ کر لاہور پہنچا تو ایک دن سرِراہ ملاقات ہو گئی۔ مولانا مجھے دیکھ کر اپنی پریشانیاں بھول گئے۔ بے حد متاسف ہوئے۔ بار بار پرسشِ احوال فرماتے تھے اور ان کے چہرے پر ایک غمناک مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ رہنے کو گھر مل گیا ہے، جان بچی لاکھوں پائے۔ بعد میں مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا پر تو خود بے گھری کا وقت پڑا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اسی افراتفری کے زمانے میں ایک اور ادبی رسالے کے ایڈیٹر انارکلی میں ملے تو بڑے زور کا قہقہہ لگا کر انھوں نے فرمایا: "اچھا! آپ بھی آ گئے۔ اب تو زبان کی ذمہ داری بھی ہم پہ آن پڑی۔" میں نے زہرخند کے ساتھ ان کو جواب دیا کہ "آپ زبان کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ زبان تو وہیں ہے جہاں ہم ہیں۔" اس پر انھوں نے اور بھی ڈھٹائی سے قہقہہ لگایا اور چل دیے۔

مولانا کے کچھ اپنے اصول تھے۔ ادھر کی دنیا چاہے ادھر ہو جائے مگر مولانا اپنے اصول سے نہیں پھرتے تھے۔ انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کسی حکومت سے مالی امداد نہیں لیں گے۔

qasarulkutub.blogspot.com

پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اسی اصول پر قائم رہے۔ مولانا چاہتے تو قیامِ پاکستان کے بعد انھیں نہایت اعلیٰ درجے کی ایک کوٹھی لاہور کے فیشن ایبل علاقے میں الاٹ ہو جاتی۔ کسی بہت بڑے ہندو اخبار کا دفتر انھیں مفت مل جاتا۔ کسی بڑے پبلشر کا پورا چھاپہ خانہ کوڑیوں کے مول مل جاتا۔ مگر اُن کی غیرت و دیانت نے اسے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے ساری عمر محنت سے اپنی روٹی کمائی۔ اسی لیے انھوں نے مفت کی دولت کو ٹھکرا دیا۔ اسی مال روڈ پر حالات سُدھر جانے کے بعد ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور اللہ کا نام لے کر پھر اپنا کام شروع کر دیا۔

"ادبی دُنیا" کے ساتھ ساتھ اب مولانا نے سستی کتابیں چھاپنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ اپنے ادارے کا نام انھوں نے "اکادمی پنجاب" رکھا۔ اکادمی سستی کتابیں چھاپیں۔ سستی سے مُراد یہ ہے کہ لاگت پر بہت کم منافع رکھ کر کتاب کی قیمت مقرر کی۔ ورنہ دوسرے پبلشر لاگت کے مقابلے میں کتاب کی قیمت تین اور چار گُنی تک رکھتے ہیں۔ مولانا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ سستی اور عمدہ کتابوں کی یہ اسکیم خاصی کامیاب رہی۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا کوئی امیر آدمی نہیں رہ گئے تھے۔ اس سستے کاروبار میں انھوں نے کئی ضخیم کتابیں بھی چھاپیں۔ مثلاً دیوانِ شیفتہ، حیاتِ جاوید، میراجی کے نثری مضامین کا مجموعہ اور ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اُردو ادب میں طنز و مزاح"۔

اس سستے کاروبار نے مولانا کو سستا "ادبی دُنیا" چھاپنے کی راہ سجھائی۔ رسائل کی عام روش یہ ہے کہ تقریباً سو صفحے کی قیمت ایک روپیہ رکھتے ہیں۔ یعنی روپیہ سیکڑہ۔ پانچ سو صفحے کی قیمت پانچ روپے اور ہزار صفحے کی قیمت دس روپے۔ مگر مولانا نے "ادبی دُنیا" کے دَورِ جدید میں تین سو صفحے کی قیمت ایک روپیہ رکھی۔ ایک تو رسالہ ویسے ہی گھاٹے کا سودا ہوتا ہے، اُوپر سے مولانا نے قیمت عہ/ رکھ دی۔ پرچہ تو ایک دَم سے چھلانگیں بھرنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ گھاٹا بھی چھلانگیں بھرنے لگا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مولانا اس نقصان کو کہاں سے پُورا کرتے تھے۔ اکلوتا مکان بیچ کر اس تجربے پر لگا دینے کی دھمکی وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ شاید یہ بھی کر گزرے ہوں گے۔ دراصل رسالوں کا خسارہ یا تو اشتہاروں سے پورا کیا جاتا ہے، یا کتابوں کی فروخت سے۔ مولانا نے ان دونوں مَدوں کی طرف توجہ دی تھی۔ سستی کتابوں کا جو تجربہ

انھوں نے کیا تھا وہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اشتہارات حاصل کرنے کا بھی انھیں کافی تجربہ تھا۔ کیوں کہ "ادبی دُنیا" خریدنے سے پہلے مولانا نے ایک اشتہارات مہیا کرنے والی کمپنی قائم کی تھی۔ پھر الیف، ایم ساقی جیسا اشتہارات کا کام کرنے والا آدمی انھیں "ادبی دُنیا" کے ساتھ مل گیا تھا۔ یہ مسٹر ساقی جب دِلّی میں پہلی دفعہ ملے تھے تو مَیں نے اُن سے پُوچھا کہ آپ کو تنخواہ کیا ملتی ہے اور آپ اپنے رسالے کے لیے اشتہارات کتنے کے مہیا کرتے ہیں؟ مسٹر ساقی نے بتایا تھا کہ انھیں تین سو روپے تنخواہ ملتی ہے اور وہ ایک ہزار کے اشتہار لا کر دیتے ہیں۔ اور جب "ادبی دُنیا" کا خاص نمبر چھپا تو اس میں تین ہزار کے اشتہارات تھے۔ یہ اُس سستے زمانے کا ذکر ہے جب سفید کاغذ کا رِم چار روپے کا تھا (اب چھتیس روپے کا ملتا ہے) گویا آج کل کے حساب سے ۲۷ ہزار کے اُس میں اشتہارات تھے۔ خیر، تو مولانا کو اشتہارات کا بھی تجربہ تھا۔ اور اب کتابوں کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس نئے اور سستے "ادبی دُنیا" کے لیے واقعی اتنے اشتہارات حاصل کر لیے کہ اُردو کے کسی اور رسالے کو میسّر نہ آسکے۔ مگر میرا اندازہ یہی ہے کہ اشتہارات کی اس کثرت کے باوجود مولانا کو نقصان ہی رہتا ہوگا۔ کیوں کہ پرچے کی مانگ روز افزوں تھی اور صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ پرچہ جتنا زیادہ چھپے گا، نقصان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ ہاں اگر عمر وفا کرتی تو مولانا مزید اشتہارات حاصل کر کے اس نقصان کی تلافی کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاتے۔ وہ دُھن کے پکّے آدمی تھے۔ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ محنت کرتے تھے۔ گھر بار کے فکر سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے۔ اُن کے دو بچّے ماشاءاللہ سی ایس پی افسر ہو گئے تھے۔ اور چھوٹے صاحب زادے میاں فصیح الدین احمد بھی ایم اے پاس کر چکے تھے۔ لہٰذا کام مولانا پر پڑا ہُوا تھا اور مولانا کام پر پلے ہُوئے تھے۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ ان کا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مولانا نے بہت کم لکھا۔ مولانا کلاسیکی ادب پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں سے انھیں والہانہ شیفتگی ہو گئی تھی۔ اور شاید پروفیسر آزاد کا فیضِ رُوحانی ہی تھا کہ مولانا بھی اپنے قلم سے آبِ حیات ٹپکانے لگے تھے۔ اب وہ دَور آگیا تھا کہ لاہور میں کوئی سربرآوردہ ادیب باقی نہیں رہا تھا۔ مولانا

qasrulkutub.blogspot.com

مُردے از غیب بن کر سامنے آئے اور ادب کے مطلع پر چھا گئے۔ ادبی تقریبوں اور ادبی جلسوں کی صدارت کے لیے مولانا سے زیادہ موزوں شخصیت اب کوئی اور نہیں ملتی تھی۔ مولانا نے سر عبدالقادر کی یاد تازہ کر دی۔ اب ادب کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک کا درد بھی اُن کے دل میں بیدار ہو گیا تھا اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں بھی مولانا کی طلب ہونے لگی تھی۔ مگر مولانا بھی اُس وقت میں ہم سے جدا ہو گئے جب ہمیں اُن کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ آخر میں وہی کچھ دُہرانا چاہتا ہوں جو میں نے ساقی میں لکھا تھا کہ :

"مولانا صلاح الدین احمد مدیر "ادبی دُنیا" کا ہم سے رخصت ہو جانا اُردو کی بدنصیبی اور اِدبار کی علامت ہے۔ مولانا نے جب سے ہوش سنبھالا، اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے ان سے قلم چھین لیا۔ مولوی عبدالحق کے بعد اُردو صلاح الدین احمد ہی کے سایۂ عاطفت میں آ گئی تھی۔ مولانا ہی اُردو کے گیسو سنوارتے تھے اور مولانا ہی اُردو کی حمایت میں سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے۔ انھوں نے اُردو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اُردو کے لیے اپنا گھر لٹا دیا تھا۔ ہماری طرح زبانی نہیں بلکہ واقعی۔ جب مولانا نے ایک روپے میں تین سو صفحے کا "ادبی دُنیا" دینا شروع کیا تھا تو استفسار کرنے پر مولانا نے فرمایا تھا کہ میرے پاس اب صرف ایک گھر رہ گیا ہے، میں اسے بھی بیچ کر اس آخری تجربے پر لگا دوں گا۔

"آخری" کا لفظ مجھے اُسی وقت کھٹکا تھا۔ مولانا کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ انھیں اب دو تین سال سے زیادہ جینا نہیں ہے۔ شاید اللہ کے نیک بندوں کو موت کا سایہ نظر آنے لگتا ہے۔ مولانا واقعی دو تین سال بعد اچانک ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی مگر اُردو ہی کے کام سے انھیں منٹگمری جانا پڑا اور وہیں موت نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ مولانا کیا گئے ان کے ساتھ ایک بہت بڑی روایت بھی ختم ہو گئی۔ مولانا صلاح الدین احمد کے بعد اُردو یتیم و یسیر ہو گئی اور ایک ایک کا مُنھ تکا کرے گی۔ ایسا جاں نثار اور شفیق سر دھرا اسے اب کہاں نصیب ہوگا۔ ع
وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

۱۹۶۵ء

علّامہ راشد الخیری

(۱)

دلّی کے ایک ممتاز مولویوں کے خاندان سے مولانا کا تعلق تھا۔ والد حیدرآباد دکن میں ملازم تھے اور بیوی بچوں سے بے پروا۔ مولانا کو اُن کی امّاں نے پالا اور میٹرک تک تعلیم دلائی۔ ددھیال میں سب عالم اور واعظ تھے۔ مولانا نے بھی ابتدا میں وعظ کہنا شروع کیا تھا، مگر بعد میں ایک مقامی سرکاری دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ مولانا بچپن ہی سے بڑے غیور تھے۔ اس لیے ابتدائی عمر عسرت میں بسر ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع کے مضامین اپنے پھوپھا مولوی نذیر احمد دہلوی کو دکھائے، اور اُن سے اصلاح لی۔ جب مخزن نکلا تو اُس میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے اور دُنیائے ادب میں مشہور ہونے لگے۔ سر عبدالقادر دہلی آ گئے تو اُن سے مولانا کے روابط بڑھ گئے۔ اور جب وہ بیرسٹری کے لیے انگلستان گئے تو ادارت کے فرائض مولانا کو سونپ گئے۔ اِسی زمانے میں مولانا نے لکھنے کی مشق بڑھائی۔ اُس زمانے میں کمپنیوں میں دائمی حقوق خرید کر دلّی کے بعض ناشر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔ اُنھی میں سے ایک سے مولانا کو بھی کچھ تعلقِ خاطر تھا۔ مولانا نے اپنی ابتدائی تصانیف اُن صاحب کے ہاتھ اونے پونے بیچیں۔ ہوتا یہ کہ جب کبھی مولانا کو کچھ روپے کی ضرورت ہوتی، دو چار دن میں ایک ناول لکھ کر بیچ ڈالتے۔ مولانا نے پچاس پچاس روپے میں اپنی بعض کتابوں کا حقِ تصنیف بیچ ڈالا تھا۔ عجب بے نیاز طبیعت پائی تھی۔ سستی فروخت کا یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا جب واحدی صاحب نے مولانا سے کتابیں معقول معاوضے پر لکھوانی شروع کیں۔ مولانا اُس زمانے میں ضرورت کے

qasrulkutub.blogspot.com

خت لکھتے تھے سب اُن سے، اگر اُن کی کوئی ضرورت اٹکی نہ ہو تو کیسے لکھوایا جائے۔ واحدی صاحب نے ان سے دو تین گھنٹے روزانہ لکھتے رہنے کا معاہدہ کیا۔ مولانا گھر سے آتے تو واحدی صاحب ان کی ضرورت کی سب چیزوں کے ساتھ انھیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیتے اور مولانا دو تین گھنٹے لکھ کر پسینے میں شرابور باہر نکلتے۔ اس طرح صبحِ زندگی، شامِ زندگی وغیرہ لکھی گئیں۔ اس عرصے میں مولانا نے اپنا پرچہ "عصمت" خواتین کے لیے جاری کر دیا تھا۔ مولانا نے سرکاری دفتر کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ گھر کا خرچ قلم چلا کر چلایا کرتے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کے بڑے صاحب زادے رازق الخیری صاحب نے عصمت مرتب کرنے اور عصمت بک ڈپو قائم کرنے میں اُن کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور رازق صاحب کی محنت ہی سے ادارہ عصمت نے وہ فروغ پایا کہ آخری عمر میں مولانا دِلّی کے اچھے خاصے رئیس آدمی سمجھے جاتے تھے۔

مولانا نے نامساعد حالات میں ہوش سنبھالا تھا اور بڑی صعوبتیں برداشت کی تھیں ان کا دِل بہت کمزور تھا۔ ذرا سے غم سے بھر آتا، ذرا سے دُکھ پر (چاہے پرایا ہی کیوں نہ ہو) تڑپ اُٹھتا تھا۔ مسلمان عورتوں کے حقوق کے لیے ساری عمر لڑتے رہے۔ اور اپنی زندگی میں اپنے مشن کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ دِل کی اس کمزوری نے انھیں مصوّرِ غم بنایا۔ اُردو ادب میں اُن سے زیادہ دردناک ٹریجیڈی اور کسی نے نہیں لکھی۔ لوگ طنزیہ انھیں "رونے رُلانے کے اُستاد" کہتے تھے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ مسلمان عورتوں کو دِق ہونے کے جو اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب مولانا راشدالخیری کی کتابیں بھی ہیں۔ مگر وہ شاید یہ بھول گئے کہ مولانا نے عورتوں کو اُس لمبی بیماری سے چھڑایا جس میں مَردوں نے انھیں مبتلا کر رکھا تھا۔

مولانا نے ایک کتاب بڑے احترام و اہتمام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ہے "آمنہ کا لال"۔ مولانا عاشقِ رسولؐ تھے۔ یہ کتاب بڑی محنت و عقیدت سے بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا روزانہ اُس کے لکھنے سے پہلے غسل فرماتے، اُجلے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، مصلّیٰ بچھاتے، نماز پڑھتے، اگربتّیاں اور لوبان سُلگاتے۔ پھر لکھنے بیٹھتے۔ اُن کی باقی سب کتابیں اور مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔

مولانا رانڈ بیواؤں، یتیموں اور غریب رشتہ داروں کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے اور اس خاموشی کے ساتھ کہ اِس ہاتھ کی خبر اُس ہاتھ کو نہ ہوتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد معلوم ہُوا کہ غریبوں اور مسکینوں کا کتنا بڑا حلقہ اُن کے سہارے پَل رہا تھا۔

مولانا کو بدزبانی یا بدکلامی کرتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے انھیں کبھی غصّہ آتے بھی نہیں دیکھا۔ اپنے عزیزوں کے لیے بے قرار رہتے۔ ایک ایک کے گھر جا کر خیریت معلوم کرتے۔ بیوی بچّوں پر تو جان ہی چھڑکتے تھے۔ اب سے دُور میاں صادق الخیری کو موتی جھرہ ہُوا تو دیوانہ وار ان کے پلنگ کے چکّر کاٹتے رہتے۔ راتوں کو پٹّی کے پاس بیٹھے رہتے۔ بچّوں سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتے۔ بلکہ اکثر ان سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے۔ ہم عمر بے تکلّف دوستوں سے وہ چھوٹ کا مذاق ہوتا کہ الٰہی توبہ، بالخصوص قاضی سرفراز حسین اور خواجہ فضل احمد شیدا سے۔

علّامہ راشدالخیری بڑے صابر و ضابط آدمی تھے۔ مرض الموت میں مبتلا ہُوئے تو ہمیشہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے کہ گویا مرض بہت معمولی ہے اور طبیعت ٹھیک ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے دِلّی کے ایک ماہرِ امراضِ سینہ نے معائنہ کے بعد نہایت بھونڈے پن سے اعلان کر دیا کہ پھیپھڑے کا کینسر ہے اور مریض کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ مولانا اُس کی ضرورت سے زیادہ صاف گوئی پر برافروختہ ہو گئے۔ بولے۔ "ڈاکٹر صاحب، مَیں جانتا ہُوں کہ مَیں مر رہا ہُوں۔ اس کا اعلان کرنا ہی کیا ضرور تھا؟" انھیں اس سے رنج پہنچا کہ بیوی بچّے ہراساں اور نااُمید ہو گئے۔ انھیں اس کا شدید احساس تھا کہ تیماردار سخت پریشان ہیں۔ ڈاکٹر کے اعلان نے ان کی پریشانی میں مایوسی بھی شامل کر دی۔ آخری وقت میں بھی مولانا کا احساسِ ظرافت زندہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مولانا کے بھانجے حاجی محمد میاں بخاری آ گئے۔ یہ قدرے سادہ لوح آدمی ہیں۔ جارج پنجم کا انتقال انھیں دِنوں ہُوا تھا۔ مولانا سے حاجی جی بولے: "بادشاہ کے تخت پر تو اب بادشاہ کا لڑکا ہی بیٹھے گا۔"

مولانا نے نحیف آواز میں فرمایا: "نہیں تمھارے حق میں وصیّت کر گئے ہیں۔" اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

qasarulkutub.blogspot.com

(۲)

اللہ اللہ کیسی شبھ گھڑی تھی وہ، جب میاں اِبّی کی امّاں بی بی رشید الزماں نے اپنے اکلوتے بیٹے سے کہا تھا کہ "بیٹا! تم کہانیاں لکھا کرو"۔ اور کم عمر میاں اِبّی نے حیرانی سے امّاں کا مُنہ تکتے ہوئے کہا تھا۔ "مگر امّاں بی مجھے تو کہانی لکھنی نہیں آتی" امّاں نے نہایت شفقت سے فرمایا "بیٹا میں سُناؤں گی تمھیں کہانیاں۔ تم بس یہ کرنا کہ انھیں لکھ کر چھپوا دیا کرنا"۔ یہ کہہ کر انھوں نے ہی کا ایک واقعہ سُنایا کہ سوتیلی ماں نے کم سن بچّوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھا رکھے تھے۔ میاں اِبّی نے اس کہانی کو ذرا بنا سنوار کر لکھا اور یہ کہانی "مخزن" میں چھپ گئی۔ اپنی پہلی کہانی پر ماں بیٹے دونوں بہت خوش ہوئے۔ بس اس کے بعد میاں اِبّی کا ہیاؤ کھل گیا اور انھوں نے باقاعدہ مضامین اور کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ یہ واقعہ اب سے ساٹھ ستّر سال پہلے کا ہے۔ یہ میاں اِبّی دِلّی کے ایک معزّز مولویوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے بچپن ہی میں ان کے والد عبدالواحد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی والدہ بڑی صابر اور غیّور خاتون تھیں۔ خاندان کے بزرگوں نے بہت چاہا کہ اُن کا نکاح ثانی کر دیں، مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔ اور پہاڑ سی جوانی سسرال میں اپنے دو بچّوں کے ساتھ کاٹ دی۔ جب میاں اِبّی سیانے ہوئے اور کمانے دھمانے لگے تو اِن غیرت مند بی بی نے سسرال سے بہت دُور شہر کے دُوسرے حصّے میں اپنا ایک کھنڈلا بنا لیا۔ اور تنگی ترُشی سے بسر اوقات کرتی رہیں۔ اسی تنگ دستی میں انھوں نے سلیقہ مندی سے اپنی بیٹی کی شادی بھی کی اور بہو بھی بیاہ کر لائیں۔ اور یہ دونوں شادیاں اس پیمانے پر کیں کہ سسرال والوں کو اُن پر اُنگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔

آپ سمجھے بھی یہ "میاں اِبّی" کون تھے؟ یہ تھے عبدالراشد، جو "مخزن" میں مولوی عبدالراشد کے نام سے آئے۔ اس کے بعد عبدالراشد الخیری اور پھر صرف راشد الخیری کے نام سے مضامین اور کتابیں لکھتے رہے۔ اور اب دُنیا انھیں علّامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔

علّامہ مرحوم کا تعلّق چونکہ جیّد مولویوں کے خاندان سے تھا۔ اس لیے مذہبی ماحول میں انھوں نے ہوش سنبھالا۔ تجویز یہ تھی کہ یہ بھی اپنے پُرکھوں کی طرح وعظ کہنے اور تبلیغ کرنے کے لیے وقف ہو جائیں۔ لہٰذا اسی نقطۂ نظر سے اُن کی تربیت اُن کے دادا، دادی اور والدہ نے

کی۔ علّامہ مرحوم نے آغازِ جوانی میں وعظ کہنا شروع بھی کر دیا تھا۔ آواز اونچی اور گرج دار تھی۔ اس لیے سامعین کو متاثر کر لیتے تھے۔ مگر وہ پیشہ ور واعظ نہیں بننا چاہتے تھے۔ باپ کا سایہ کم عمری ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ دادا بہت امیر آدمی تھے مگر اُن کی امارت سے انھیں کوئی فائدہ پہنچنے کی صُورت باقی نہیں رہی تھی۔ دادا کی موجودگی میں بیٹے کے مَر جانے سے شرعاً وہ محروم الارث ہو گئے تھے۔ لہٰذا مولانا چاہتے تھے کہ جلد از جلد خود کمانے کے لائق ہو جائیں۔ طبیعت کا رُجحان لکھنے لکھانے کی طرف تھا۔ لہٰذا میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مضامین لکھتے رہے اور نوکریاں کرتے رہے۔ نوکری سے بھی رغبت نہیں تھی، اس لیے افسروں سے نہیں بنتی تھی اور نوکریوں کو جُوتیوں کی طرح بدلتے رہتے تھے۔ اور نوکریاں تھیں کہ ان کی جوتیوں سے لگی پھرتی تھیں۔ اِدھر چھوڑی اُدھر مِلی۔ جب لاہور سے منتقل ہو کر "مخزن" دِلّی آیا تو شیخ عبدالقادر صاحب نے مولانا کو اپنا دستِ راست بنا لیا۔ شیخ صاحب ہی کے اصرار پر انھوں نے ناول نگاری شروع کی اور اپنا پہلا ناول لکھ کر اپنے پھپھا اور اُستاد ڈپٹی نذیر احمد کی خدمت میں بغرضِ اصلاح پیش کیا۔ خیر نہیں اس ناول میں کیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ناراض ہوئے۔ اور تاکید کی کہ اگر ناول لکھنا چاہتے ہو تو ایسے لکھو جیسے میں لکھتا ہوں۔ مولانا نے اپنے اس ناول کا مسوّدہ ضائع کر دیا اور ڈپٹی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ناول "صالحات" لکھا۔ اُسے دیکھ کر ڈپٹی صاحب خوش ہو گئے۔ اور انھوں نے فرمایا کہ "اگر مجھے یقینِ کامل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ "صالحات" میری لکھی ہوئی ہے اور مسوّدہ چوری گیا۔"

پسندیدگی کی سندِ اُستاد سے پانے کے بعد مولانا نے ملازمت کو دھتا بتائی اور قلم ہی کے ہو رہے۔ دوست احباب سب اچھے ملے۔ سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کرنے والے تو شیخ عبدالقادر صاحب ہی تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمد اکرام، مولوی اشرف حسین، شہزادہ مرزا ارشد گورگانی، قاری سرفراز حسین، ان کے علاوہ واحدی صاحب، خواجہ حسن نظامی، عارف ہسوی، آصف علی بیرسٹر، خواجہ فضل احمد شیدا۔ سبھی اعلیٰ ادبی ذوق کے لوگ تھے۔ واحدی صاحب، جن کا ابھی میں نے نام لیا ہے اور جو حُسنِ اتفاق سے کراچی میں موجود ہیں، عجیب مقناطیسی شخصیت کے بزرگ ہیں۔ کوچہ چیلان میں ان کا دولت کدہ ادیبوں کا مرجع تھا۔ واحدی

qasarulkutub.blogspot.com

صاحب ادیب بھی ہیں اور ادیب گر بھی۔ انھوں نے ساری عمر اچھے سے اچھے رسالے نکالے اور ادب کی خدمت کے لیے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ مولانا راشد الخیری کے مزاج میں درویشی کا لاابالی پن تھا۔ انھیں اس کا احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے عظیم المرتبت مصنّف بن گئے ہیں۔ لوگ اُن کے مضامین اور کتابیں پڑھنے کے لیے چشم براہ رہتے تھے۔ مگر وہ سب سے بے پروا صرف اُس وقت لکھتے تھے جب اُن کا جی چاہتا تھا۔ واحدی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے مولانا سے زبردستی لکھوایا۔ وہ اس طرح کہ مولانا کو روزانہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیتے اور چند گھنٹے بعد مولانا کو کُنڈی کھول کر باہر نکالتے تو مولانا پسینے میں شرابور برآمد ہوتے اور میز پر ۲۵ - ۳۰ صفحات لکھے ہوئے موجود ہوتے۔ غالباً "شامِ زندگی" اسی طرح لکھوائی گئی۔

مولانا نے ۱۹۰۹ء میں ماہنامہ "عِصمت" جاری کیا، اور اس کے دو سال بعد ایک مردانہ پرچہ "تمدّن" نکالا۔ اس زمانے میں مولانا نے کتابیں کم لکھیں۔ مگر چند سال بعد اُن کے خلفِ اکبر مولانا رازق الخیری نے "عِصمت" کو سنبھال لیا۔ اور "تمدّن" کو ان کے دوست قاری سرفراز حُسین کے صاحب زادے عبّاس حسین صاحب نے مانگ لیا تو مولانا مغفور کو کتابیں لکھنے کی فرصت مل گئی۔ اور انھوں نے تابڑ توڑ کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اُن کی بڑی صاحب زادی راشدہ بیگم صاحبہ بیاہ کر گنگاپور چلی گئی تھیں۔ مولانا گنگاپور جاتے تو فرصت ہی فرصت ہوتی۔ یہیں انھوں نے منجملہ اور کتابوں کے "آمنہ کا لال" اور "فاطمہ کا لال" جیسی بے مثل کتابیں لکھیں۔ آپا راشدہ کا بیان ہے کہ ابّا جان صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک کمرے میں اگربتیاں جلاتے۔ ایک طشتری میں پھول بھر کر اپنے پاس رکھ لیتے، اور فرش پر مؤدبانہ بیٹھ کر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔ جبھی تو یہ دونوں کتابیں سدا بہار ہیں، اور رہتی دُنیا تک مہکتی رہیں گی۔

مولانا کے پہلو میں ایک چوٹ کھایا ہوا دِل تھا۔ چھوٹی سی عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہوئے۔ ماں کی عمر رنڈاپے میں کٹی۔ ددھیال کی محتاجی اور تنگ دستی میں مبتلا رہے۔ امیر دادا کے ورثے میں سے غریب پوتے کو کچھ نہ ملا۔ خلافِ مزاج نوکریاں کرنی پڑیں۔ ددھیال

بھی امیر اور ننھیال بھی امیر، مگر خود پردیس میں چھوٹی تنخواہ کے نوکر۔ بیوہ ماں اور چھوٹی بہن کا ساتھ۔ پریشانیوں کے ہجوم میں زندگی کے ابتدائی سال گزرے۔ غم اُن کے گھُٹ میں اُتر گیا تھا۔ یہی غم ان کی تحریروں میں بھی رَچ گیا تھا اور حُزن نگاری اُن کے لیے مخصوص ہو گئی۔ مگر کس بلا کا غم اور کس غضب کا حُزن تھا کہ ہم نے لوگوں کو ان کی کتابیں پڑھ کر دھاروں روتے دیکھا۔ ان کے اسی اندازِ تحریر کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی نے مولانا کے نام سے پہلے "غم ادا" لکھنا شروع کر دیا تھا، اور رہبّا احسان نے انھیں "مصوّرِ غم" کا خطاب دیا تھا۔ اور یہ خطاب اس درجہ موزوں ثابت ہوا کہ مولانا کے نام کا جُزوِ لاینفک بن گیا۔

شیخ عبدالقادر اور واحدی صاحب کے بعد تیسرا نمبر رازق الخیری صاحب کا ہے۔ بلکہ سب سے اہم رول (ROLE) موخّر الذکر ہی کا ہے کہ انھوں نے کتابت، طباعت و اشاعت وغیرہ کے جھنجھٹوں سے علّامہ مرحوم کو فارغ کر دیا۔ اور محنت و دیانت داری سے عصمت کو اتنا فروغ دیا کہ اُس کی اشاعت دیکھتے ہی دیکھتے دس گنی ہو گئی۔ علّامہ اطمینانِ قلب سے کتابیں لکھتے رہے۔ اور مولانا خاص اہتمام سے انھیں چھاپتے رہے۔ اس دھندے میں اتنی برکت ہوئی کہ روپے کی ریل پیل اور گھر میں لہر بہر ہو گئی، اور جب علّامہ ۱۹۳۶ء میں ہم سے رخصت ہوئے تو اچھے خاصے رئیسوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا رازق الخیری نے "عصمت" کے علاوہ دو اور رسالوں "بنات" اور "جوہرِ نسواں" کو بھی بامِ ترقی پر پہنچا دیا اور سیکڑوں کتابیں بھی چھاپ ڈالیں۔ مگر ایک ضروری کام رہا جاتا تھا۔ اس کا خیال انھیں علّامہ مرحوم کی وفات ہی کے بعد سے ستا رہا تھا۔ مولانا اپنے والد مرحوم کی سوانح عمری ایک نئے انداز سے لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اسی وقت سے مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے آشوب میں ان کے بیش بہا مسوّدات ضائع ہو گئے۔ اور کراچی جانے کے بعد حالات نے انھیں سنبھلنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اب چند سال سے مولانا کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اور انھیں محسوس ہوا کہ اس فرض کو مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا دن رات ایک کر کے انھوں نے علّامہ مرحوم کی سوانح عمری سال ڈیڑھ سال میں تیار کر لی۔ اس کی اشاعت کے لیے انھیں جو

dasarulkutub.blogspot.com

ہفت خواں طے کرنے پڑے، ان کی ایک الگ داستان ہے جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہرحال اللہ نے یہ مشکل بھی آسان کی اور مولانا اپنے فرض سے ادا ہوئے۔

یہ سوانح عمری "عصمت" کی پچاسویں سال گرہ پر "عصمت" کے ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔ مولانا کا کارنامہ آپ کے سامنے ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور اس محنت کی داد دیجیے۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

۱۹۶۵ء

قاری سرفراز حسین دہلوی

یادش بخیر دہلی مرحوم کی آخری بہار میں شاہ جہانی دیگ کی کھرچن باقی رہ گئی تھی اُسے میری آنکھوں نے بھی دیکھا اور اب بھی جب کبھی اس کا خیال آجاتا ہے تو زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ ہا! کیسی کیسی صورتیں پیوندِ خاک ہوگئیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ یوں تو ۵۷ء کی آندھی میں لال پردے کے پرزے اُڑ گئے تھے اور مغلوں کا آفتاب جاہ و جلال غروب ہوگیا تھا مگر سخت جان دِلّی نے ایسے سیکڑوں انقلاب دیکھے تھے، بگڑ کر پھر سنور گئی۔ سر سیّد اور اُن کے رُفقا نے مُسلمانوں کی آبرو رکھ لی اور ایک نئی تہذیب کا ڈول ڈالا۔ علی گڑھ نے مغرب اور مشرق میں سوئے ہوئے نوجوان مسلمانوں کی کھیپ پر کھیپ نکالنی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے مُسلمانوں نے اپنا کھویا ہُوا وقار دوبارہ حاصل کیا۔ انھیں جوانوں میں سے ایک رَو دار جوان قاری سرفراز حسین دہلوی تھے جنھوں نے اس صدی کے ابتدائی بتیس پینتیس سال میں دُھوم مچا رکھی تھی۔ زمانہ بڑا ناقدرا اور زود فراموش ہے۔ افسوس رُبع صدی ہی میں قاری صاحب کو لوگ بھُولنے لگے۔ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے۔

میرے والد کے پاس جو حضرات اکثر آتے تھے اور جن کے گھر وہ اکثر جایا کرتے تھے ان میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بڑے ٹھسّے کے تھے۔ دُہرا ڈیل، کسرتی بدن، سر پر کرسٹی کی ترکی ٹوپی، کالا فراک کوٹ، سفید پتلون، پاؤں میں ڈاسن کا کالا شو، داہنے ہاتھ میں چھڑی، بائیں ہاتھ میں سفید دستانے، گول چہرہ، گیہواں رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، موزوں دہانہ، کتروان مونچھیں، مختصر سی خوشنما ڈاڑھی، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ جس میں سے ان کی ذہین آنکھیں اپنی چمک دمک دکھاتی رہتیں۔ ان سے ہمارے گھر میں پردہ نہیں کیا جاتا تھا۔ ابا انھیں دیکھتے ہی کھل جاتے اور اپنی ساری سنجیدگی و بُردباری بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ قاری سرفراز حسین عزمی

دہلوی، جو اپنی باتوں سے ظرافت کے پھول کھلاتے رہتے۔ بڑے زندہ دل، بڑے خوش کلام۔ اُن کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ زندگیوں کی زندگی پر آٹھ دس ناول لکھے جن میں سب سے مشہور "شاہد رعنا" ہے۔

یہ وہ کتاب ہے جسے دیکھ کر مرزا رُسوا نے "امراؤ جان ادا" لکھی۔ ناولوں کے علاوہ قاری صاحب نے علم الکلام پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ تبلیغ کے سلسلے میں انگلستان اور جاپان تک گئے تھے۔ قاری صاحب اس قدر خوش گفتار تھے کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے لیے ترستے تھے۔ مذہب، ادب، سیاست، تاریخ، کسی گھر بند نہیں تھے۔ ایک دفعہ مسوری میں ایک رئیس نے چاہا کہ قاری صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی باتوں سے اُن کا جی بہلایا کریں۔ قاری صاحب نے ٹالنے کے لیے کہلوا دیا کہ میں سو روپے فی گھنٹہ لوں گا۔ اگر منظور ہو تو طلب فرمائیں۔ وہ بھی لکھ لٹ دل رئیس تھے۔ دو سو روپے روزانہ دیتے رہے۔ اور قاری صاحب وہ روپیہ انجمنِ اسلامیہ کو بھیجتے رہے۔

قاری صاحب گو میرے خاندان سے نہ تھے لیکن میرے خاندان سے ان کے تعلقات بالکل عزیزوں ہی کے سے تھے۔ میرے والد کے خلیرے بھائی مولوی اشرف حسین صاحب جنھوں نے مثنوی میر حسن پر مقدمہ لکھ کر میر حسن کو حیاتِ تازہ دی تھی۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر احمد حسین سول سرجن لاہور کے والد اور سید انصار ناصری ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کے نانا تھے، اُن سے قاری صاحب کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ مولوی اشرف حسین صاحب کی وجہ سے قاری صاحب ہمارے قدیمی محلہ کوچہ نواب مرزا میں تقریباً روز آتے تھے۔ ویسے تو میرے والد مولوی بشیر الدین احمد سے قاری صاحب کے تعلقات بہت تھے لیکن والد مرحوم کی انتہائی سنجیدہ مزاجی اور بزرگی کے باعث قاری صاحب اُن سے بہت ادب قاعدے سے ملتے تھے۔ اُن کے علاوہ شاید ہمارے خاندان کا کوئی فرد بھی ایسا نہ تھا جو قاری صاحب کی بذلہ سنجی اور پھبتیوں کا ہدف نہ بنا ہو۔ گھر میں اکثر قاری صاحب کا ذکر ہوتا تھا جس میں قاری صاحب کی ظرافتوں کو سراہا جاتا تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے میرے کانوں میں برابر قاری صاحب کا نام پڑتا رہا۔ اور اس چوکڑی کا تذکرہ بھی بہت ہوتا تھا جس میں مولوی اشرف حسین صاحب، مرزا محمد اشرف گورگانی صاحب، قاری سرفراز حسین صاحب اور علامہ راشد الخیری شامل تھے۔ جب یہ چوکڑی جمتی تو قاری صاحب کو کوئی نہ کوئی نئی سوجھتی۔ ایک دفعہ پھوپھی اماں بڑے

مزے لے لے کر بیان کر رہی تھیں کہ قاری صاحب نے دھوبن کی آنکھ بچا کر اس کی گٹھڑی میں ایک بھاری پتھر باندھ دیا۔ اب میلے کپڑوں کی گٹھڑی بے چاری سے کسی طرح اُٹھتی ہی نہ تھی۔ جب وہ گٹھڑی اٹھانے کی کوشش کرتے کرتے ہلکان ہو گئی تو مرزا محمد اشرف صاحب اور مولوی اشرف حسین صاحب کو دھوبن پر ترس آ گیا۔ انھوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور اس طرح گٹھڑی میں سے پتھر نکال کر پھینکا گیا۔ چوں کہ دھوبن بہت پریشان ہو گئی تھی اور گٹھڑی اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی، اس لیے ایک دم سے بالکل بگڑ گئی۔ اور اُس نے بڑا فیل مچایا۔ ڈپٹی صاحب (میرے دادا) مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کو اطلاع ہوئی اور چوکڑی کو طلب کیا گیا لیکن یہ سب فرد ہو چکے تھے۔ اُس وقت تو ڈانٹ سے بچ گئے لیکن بعد میں سب پر ڈانٹ پڑی۔ ڈپٹی صاحب کی ایک اور ڈپٹ کا ذکر بھی اکثر سنا گیا ہے۔ اس کے ہدف چوکڑی کے دو ارکان تھے: قاری سرفراز حسین صاحب اور علامہ راشد الخیری۔ ہُوا یہ کہ ۱۹۱۱ء میں شیخ عبد القادر کی سرپرستی میں علامہ راشد الخیری نے رسالہ "تمدن" جاری کیا۔ اس کے پہلے پرچے میں قاری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہُوا جس کا عنوان تھا "انسان فرشتے کی عینک سے"۔ یہ مضمون ڈپٹی صاحب کے نزدیک بہت قابلِ اعتراض تھا، اس لیے کہ اس میں مذہبی روایات کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ اس مضمون کا ابتدائی حصہ یہاں نقل کرتا ہوں کہ آپ بھی اس نایاب مضمون سے لطف اندوز ہوں۔

"ایک نوعمر فرشتہ جو ہنوز ملاءِ اعلیٰ کی انتہائی تعلیم سے فارغ نہ ہُوا تھا اور جسے بنا بریں نہ ابھی کوئی ڈگری ملی تھی اور نہ کوئی خدمت تقدیس تحمید وغیرہ کی عطا کی گئی تھی، سنٹرل عرشیہ کالج کی موسم برشگال کی تعطیل میں اپنے چیف پراکٹر مسٹر فصطاعیل کی اجازت سے چند ہفتے دُنیا کی سیر کرنے کی غرض سے رفعت کورٹ سے، جو ذوالجلال بورڈنگ ہاؤس کا ایک نہایت پُرفضا حصّہ ہے، روانہ ہُوا۔ یہ مبتدی متعلّم فرشتہ دوستوں کا بہت وسیع دائرہ نہ رکھتا تھا، پھر بھی اس کے ہم مذاق چند دوست فرشتے ایسے تھے جنھوں نے روانگی سے پہلے اسے ایک مختصر الوداعی ڈنر دیا۔ فرشتوں کو زیادہ بولنے چالنے کا شوق نہیں ہے۔ تاہم ایک آدھ ٹوسٹ پیش ہونی ضروری تھی۔ فورتھ ایئر کلاس کا ایک طالب علم فرشتہ طرفیل نامی چیئرز کی گونج میں اپنی نورانی کرسی پر سے اُٹھا اور شام کے مہمان کا جامِ صحت تجویز کرتے وقت اِس طرح گہر افشاں ہُوا:

qasrulkutub.blogspot.com

فضائے عرش کے نو عمر مکینوں کی زندگی میں آج کا دن تاریخِ جاوید کا ایک نیا ورق اُلٹے گا ۔ کیوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم میں سے کسی نے حضرتِ انسان کے مطالعے کے قصد سے دُنیا کے دُور دراز سفر کی اولوالعزمی اختیار کی ہو۔ ہمارے مقدس بزرگ مہتر جبرائیل کو عالمِ خلق میں تشریف لے گئے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا اور اب ان سے دُنیا کی کوئی تازہ خبر نہیں ملتی۔ ہمارے دُوسرے مقدّس بزرگ حضرت عزرائیل ہر روز، ہر گھڑی، ہر لحظہ وہاں آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان کا کارِ منصبی گو بہت اہم ہے، تاہم محدود ہے۔ اور چوں کہ ان کے محکمے کی کل کارروائی کانفی ڈینشل ہے، اس لیے ہم لوگوں کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ہم لوگ فرشتوں میں سے کوئی اولوالعزم کمرِ ہمت باندھے اور دُنیا میں جا کر وہاں کے حالات قلم بند کرے۔ میں اپنے معزز دوست سرقیل کو تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں اور ان کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں۔"

بڑے جوش اور سرگرمی سے یہ جامِ طہور نوش کیا گیا۔ اب سب کی آنکھیں ظریف فرشتے کی طرف اُٹھیں جنھوں نے انسان کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے حسبِ ذیل تقریر کی :

" مجھے انسان کا جامِ صحت پیش کرنے کا خاطر خواہ حق حاصل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک مجھ کو صحیفۂ اعظم کے مطالعہ سے معلوم ہوا، انسان کا تعلق فرشتوں سے کم ہے مگر حوروں سے زیادہ ہے، اور یہ ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان کو ہم سے تعلق پیدا کرنے میں سراسر تکلیف ہے۔ بے چارے کو فاقے دیے جاتے ہیں، یہ لالچ دے کر کہ تجھ میں ملکوتی صفات پیدا ہو جائیں گے۔ سونا کم کر کیوں کہ فرشتے سوتے نہیں۔ ہنسنا بولنا چھوڑ دے اس لیے کہ فرشتے متین ہوتے ہیں۔ دن رات تسبیح لیے بیٹھا رہ، اس لیے کہ فرشتے بھی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اب آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ انسان کو کیا پڑی ہے کہ اپنی جان پر یہ سب مصیبتیں لے؟ صرف اس لیے کہ ہم سے تھوڑی بہت مشابہت پیدا کرے۔ ہم میں سے بعض تو اس کے جانی دشمن ہیں۔ اس کے کندھوں پر بیٹھ کر اس کا کچا چٹھا لکھتے رہتے ہیں۔ بڑے ابا جان حضرت عزرائیل سے تو ہر انسان کی رُوح کانپتی ہے (سنو سنو) بھلا پھر انسان ہمیں اچھا سمجھ سکتا ہے؟ اور جب یہ حالت ہے تو اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ (افسوس افسوس) البتہ پرلے تار کے لطیف طبقہ سے جنھیں حُوریں (چیئرز) کہتے ہیں، انسان کے دل کو بہت لگاؤ ہے۔ اصل

وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اگر پیارا سرقیل دُنیا کے سفر میں صرف ایک اس راز کا پتا لگا لایا، تو ہم سمجھیں گے اُسے کافی کامیابی ہو گئی۔ مگر ہاں قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنسانِ ضعیف اِنسان میں لالچ کا مادہ بہت ہے اور حوریں شاید کچھ بڑی نعمت کی چیز ہوں گی۔ نماز پڑھو تو جنّت میں حوریں ملیں گی۔ نیچی نگاہ کر کے چلا کرو، حوریں ملیں گی۔ یہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی، وہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی۔ وغیرہ وغیرہ (قہقہہ) اب نہیں معلوم کہ حوروں کے کس قدر پہلو ہیں کہ ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے پر ان کا ایک نہ ایک پہلو بطور انعام کے انسان سے چپقلش ہو سکتا ہے (قہقہہ) افسوس کہ میرا بیان غیر مکمل بلکہ گونہ مُہمل ہے، اس لیے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے انسان بھی دو طبقوں میں منقسم ہے ایک غالباً کثیف اور دُوسرا حوروں کی طرح لطیف۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہماری حوریں انسانِ کثیف کو ملیں گی تو حوروں نے کیا قصور کیا ہے؟ اور اگر انسانِ لطیف کو ملیں گی تو بات ہی کیا ہوئی؟ (سنو سنو)

پیارے سرقیل، ضرور اس کا پتا لگائیو (چیئرز) ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھ کر پھر بھی جو میں انسان کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سُنتے آئے ہیں۔ جب حضرتِ انسان پیدا کیا گیا تو ہمارے سب بزرگوں سے اسے سجدہ کرایا گیا۔ اور سوائے اس بزرگ کے (توبہ توبہ اب ہم میں سے کوئی بھی انھیں بزرگ کہنے کا مجاز نہیں ہے) سب نے سجدہ کیا۔ سجدہ نہ کرنے پر وہ بارہ پتھر باہر کیے گئے۔ ان کا (ایفی جی) بُت جلایا گیا۔ اور دفترِ قدیم میں درج ہے کہ تعزیراتِ قدس کی تعذیبی دفعہ کی انتہائی سزا نہیں دی گئی (نعرہ ہائے لاحول لاحول) پھر کوئی بات تو ہے جو انسان کو یہ شرف بخشا گیا (ضرور ہو گی، ضرور ہو گی) عقل مند سرقیل کیا تم اپنے سفر میں اس معمّے کو بھی حل کرو گے؟

تقریر کا جس میں ہر چند ظرافت شامل تھی کچھ ایسا اثر ہوا کہ مجوزہ جام نوشِ جان کرتے وقت بعض معمّر اور فرض شناس فرشتوں نے گردنیں تک جھکا لیں۔ یہ جلسہ بڑی خیر و خوبی کے ساتھ برخاست ہوا اور اس کی رُوداد موتیوں کے حرفوں میں چھاپی گئی۔

راوی لکھتا ہے کہ باوجودے کہ ہر طرح اہتمام کر لیا گیا تھا کہ یہ باتیں سوائے فرشتوں کے اور کسی کو معلوم نہ ہوں مگر کسی طرح اس رُوداد کی دو چار کاپیاں الہلال ایڈیٹر کے پردۂ راز کے

darulkutub.blogspot.com

اندر پہنچ گئیں جس سے حوروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

اتفاق وقت جب یہ پرچے حوروں میں پہنچے تو میوزک (موسیقی) کا گھنٹہ ختم ہو کر کالج بند ہو گیا تھا اور حوریں بناؤ سنگھار کرنے اپنے اپنے کمروں میں جا رہی تھیں۔ وہاں سے بعض ٹینس کھیلنے آئیں۔ بعض سیدھی رنگ میں اسکیٹنگ کرنے جاتیں، یہ پڑھ کر کہ انسان حوروں کا بہت مشتاق ہے، بعض خوش بعض چیں بجبیں ہوئیں۔ بعضوں نے آج بناؤ سنگھار اور اچھی طرح کیا۔ نئی ٹائیاں، نئے ربن (فیتے) نئے پھول لگائے اور اپنے کمروں کی شیشیاں لنڈھا دیں۔ (مخفی نہ رہے کہ کچھ عرصے سے حوروں میں بناؤ سنگھار کا کورس ترمیم ہو گیا ہے)

پرانی حوروں کو تو اب تک کنگھی، چوٹی، سرمہ مسّی وغیرہ کی اجازت ہے۔ ساتھ میں بھی قدامت پسندی کا عیب ہے۔ بے جوڑ گنواری گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے خلخل کرتے ہوئے پیجامے (گھیتلے جوتے کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ ماشاء اللہ حوریں فیشن کی موجد ہیں) جن حوروں کو انسان سے وابستہ ہونے کا خیال ناگوار گزرا انھوں نے بالکل بناؤ سنگھار نہ کیا اور نہ کھیلنے گئیں، رو رو کر آنکھیں سُجا لیں اور کئی ایک سے تو نماز مغرب بھی وقت پر ادا نہ ہوئی۔ رائٹر کا خاص نامہ نگار لکھتا ہے کہ انھوں نے کوئی کانفی ڈینشل میموریل تیار کیا تھا۔ اس پر کمیشن بیٹھا تھا جس کی رپورٹ بھی تیار ہوئی تھی مگر سوائے ان چند احکامات کے اور کوئی بات پبلک نہ کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

ڈپٹی صاحب اس مضمون کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ دونوں کی طلبی ہوئی بلا مرہ اللہ الجزی فوراً حاضر ہو گئے۔ ڈپٹی صاحب نے اُن کو بہت بُرا بھلا کہا۔ دُوسرے دن قاری صاحب کی پیشی ہوئی۔ ڈپٹی صاحب اُن پر بھی بہت برسے۔ دونوں نے توبہ تلّا کی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ قاری صاحب کی ان پُرمذاق حرکتوں کے تذکرہ کے ساتھ اُن کی علمی قابلیت اور جاپان میں تبلیغِ اسلام کی سعی کا بھی بہت چرچا رہتا تھا۔ اب مجھے کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا اور قاری صاحب کی ان متضاد قابلیتوں پر کچھ حیرانی بھی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میرے یہ بزرگ کس قماش کے آدمی ہیں؟ لیکن ان کے سامنے جانے کے بعد ان سے کچھ محبت سی ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ہم بچوں سے بڑے پیار اور محبت سے ملتے۔ اچھی اچھی باتیں کرتے، اور ہنسنے ہنسانے والے لطیفے سُناتے

تھے۔ غرض یہ کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے دل میں اُن کی خاصی قدر تھی، جو برابر بڑھتی ہی گئی۔ جوں جوں میں جوان ہوتا گیا اور لکھنے پڑھنے کی کچھ سُدھ بُدھ ہوتی گئی تو دل پر ان کی قابلیت کا سکّہ بیٹھتا گیا۔ چناں چہ جب وہ وقت آیا کہ میں نے ۱۹۲۹ء میں رسالہ "ساقی" جاری کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے سلسلہ میں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو قاری صاحب بہت محبت سے ملے۔ جو کچھ اُن سے پوچھا اُس سے زیادہ بتاتے رہے اور مضمون لکھنے کی خواہش پر اُنھوں نے کہا کہ "ساقی" میں اپنا ایک ناول مسلسل لکھا کروں گا۔ چناں چہ قاری صاحب کا ناول "ثروت دُلھن" ساقی میں چھپتا رہا۔ اُس زمانے میں قاری صاحب کی خدمت میں مجھے اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا۔ اُس زمانے میں قاری صاحب کی یہ خصوصیت بھی پورے طور پر منکشف ہوئی کہ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے بن جاتے تھے میں جوان ہوتا گیا اور قاری صاحب بوڑھے ہوتے گئے۔ لیکن قاری صاحب کی خوبیاں میرے دل پر اور زیادہ نقش ہوتی گئیں۔

قاری صاحب کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر بھی وہی شخص بہتر طریقے سے کر سکتا ہے جو اتنی خصوصیات کا حامل ہو۔ لیکن مجھے اس کا دعویٰ نہیں۔ اِس لیے سوائے اِس کے چارہ نہیں کہ قاری صاحب کی تصانیف کے اقتباسات پیش کر کے اُن کی خصوصیات کو اُجاگر کروں۔ آپ نے "اِنسان فرشتے کی عینک سے" کا اقتباس تو ملاحظہ فرما لیا۔ اب ایک دُوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس کا طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان بالکل جُداگانہ ہے

سوال: اے دلِ بے مدعا، یہ جان متی کا تماشہ ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ بیگم صاحبہ (ہِز ہائی نس سلطان جہاں بیگم والئی بھوپال) کی سواری دُور سے جاتی ہو، تو جہاں ہے ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنے دُکھ درد کچھ کم ہیں جو نواب صاحب کی تندرستی کی دُعا میں مانگتا ہے؟ اپنے بال بچوں سے دُور پڑا ہے مگر صاحب زادے صاحب کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میری جان تجھ میں کیا کمی ہے جو ناظم صاحب نائب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے؟ سچ بتا کوئی غرض تو اس میں پوشیدہ نہیں ہے؟ یہ نہیں تو صرف امارت کا رُعب ہے؟ یہ جو "آپیئے حضرت" کہہ کر مزاج پوچھتے ہیں اس سے دِل بڑھ جاتا ہے؟"

qasarulkutub.blogspot.com

دیکھ سلامت روی کے مرکز سے مت ہٹ۔ تو شتی حسین کا تو بہ فضلہ تعالیٰ مالک ہے، ریاست، وزارت، نیابت، سب سے بڑھ کر ہے۔ فارغ البالی جو تجھے نصیب ہے خشش والی بے انتہا دولت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ چل اس دنیا پست چیز سے منہ موڑ، گوشہ نشینی اختیار کر، اللہ کا نام لے اور قناعت اور سرور دائمی کی موت مرنے کے لیے مردانہ وار تیار رہ۔"

جواب: "اے پیاری روح، اے صدائے ربانی! تیری تنبیہہ، تیری جھڑکیوں اور لعن طعن پر ظاہر بینوں کی ہزار ہا تحسین و آفرین قربان۔ خدا تجھے قائم رکھے تو نے اچھے وقت خبر لی۔ دل میں جو کچھ چور ہیں ان سے تو بھی واقف ہے۔ خدا شاہد ہے بیگم صاحبہ سے بہت زیادہ عظمت دل میں اس دکھیاری بیوہ عورت کی ہے جو چکی پیس کر اپنا پیٹ بھرتی ہے اور اپنے یتیم بچوں کا بھی۔ جسے نہ کوئی کپڑا نہ پیٹ کو روٹی۔ عزت نہ آبرو۔ مگر جو محنت، صبر اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کرکے حیاتِ عظیم الانسانی کی تصویر میں ایک گم نام مگر بے حد ضروری کڑی ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔"

نواب صاحب کو خدا صحت اور عمر عطا فرمائے۔ سچ کہتا ہوں کہ ان کی جان سے ہزار درجہ زیادہ اس شخص کی جان عزیز ہے جو غریب کنبہ، غریب بچوں، غریب عورتوں کا وارث ہے۔ جس کو نہ کوئی تفریح درکار ہے نہ سامانِ عیش۔ فرض اور ادائے فرض جس کی جانِ عزیز کی صدائے پر درد ہے۔ جس پر ہر امیر جس وقت چاہے ظلم کر سکتا ہے، اور کر لیتا ہے۔ جس پر ہر آفت جس وقت چاہے آ جاتی ہے۔ مگر جس کے دل سے گھر بار کی فکر، محنت اور استقلال کا خیال ایک لمحہ بھر کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتا۔ صاحب زادے صاحب سے کہیں زیادہ معصوم بچے دل میں لیے ہوئے ہیں جن کو آنکھ کھول کر نہ باپ کا سایہ نصیب ہوا نہ ماں کا کھوا۔ جو کسی کے سامنے منہ سے نہیں نکال سکتے کہ ہمارا جی کیا کھانے کو چاہتا ہے اور کیا پہننے کو۔ عرش کے کنگورے ان کے درد پر ہل جائیں مگر بے درد دنیا ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ وزرا، امرا بہت دیکھے ہیں مگر ہم تو ان سادہ مزاج سادہ حال غریبوں کے دیوانے ہیں جن کے دل خوفِ خدا سے لرزتے ہیں اور جن کو تصنع اور تکلف کی ایک بات بھی نہیں آتی۔

لیکن میری جان حقیقت یہ ہے کہ اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہو اور غریبوں کا دکھ درد کوئی ان کو بتاتا رہے تو پھر دیکھو یہی امیر ظلِ سبحانی ہیں یہی امیر ابرِ رحمت ہیں۔ یہی بے کسوں کا سہارا اور لاوارث بیواؤں اور یتیموں اور مظلوموں کے پشت پناہ ہیں۔ ان کا مشن پورا اور ان کی نجات محفوظ

ہے۔ اگر ان غریبوں کے حال پر نظرِ ترحم رہے یہی دعا ہے اور اسی لیے ان کو سلام کہتا ہوں۔"

تبلیغِ اسلام قاری صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ غالباً اس لیے کہ ان کے دل میں احیائے ملت کی تڑپ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی صحیح تعلیم اور اس پر دیانت داری سے عمل مسلمانوں کی رفعت کا موجب ہو سکتا ہے۔ چناں چہ اس موضوع پر انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور رسائل و اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔ چوں کہ یہ سب کچھ آج سے تیس چالیس برس پہلے کی باتیں ہیں اس لیے قاری صاحب کی تجاویز من وعن آج نہ قابلِ قبول ہیں نہ قابلِ عمل۔ کیوں کہ اب دنیا بدل چکی ہے۔ تاہم قاری صاحب کی تجاویز میں اتنی جان اب بھی ہے کہ اگر حکومت کا سر رشتہ تعمیرِ نو ان کا بہ غور مطالعہ کرے تو وہ بہت سی ایسی باتیں اخذ کر سکتا ہے جو احیائے ملت میں معاون ہو سکتی ہیں۔

۱۹۶۴ء ——————

qasarulkutub.blogspot.com

آغا شاعر قزلباش

اللہ کسی کی بنا کر نہ بگاڑے۔ آغا شاعر قزلباش دلّی کی ان ہستیوں میں سے تھے جن پر دلّی کو فخر تھا۔ اُردو کو فخر تھا، ہندوستان کو فخر تھا۔ آغا جب شہرت کے پر لگا کر اُڑے تو اوجِ ثریا پر پہنچ گئے اور جب گرے تو تحت الثریٰ میں اُتر گئے۔ انھوں نے بہت اچھا زمانہ دیکھا اور بہت بُرا بھی۔ اُن کی جوانی قابلِ رشک تھی اور بڑھاپا نمونۂ عبرت۔ جوانی میں بڑے سجیلے آدمی تھے۔ میدۂ شہاب رنگ، کھلی پیشانی، غلافی آنکھیں، جن میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے۔ بڑی بڑی مونچھیں، گھٹی ہوئی ڈاڑھی، دُہرا ڈیل، جھوم کر چلتے تھے۔ جدھر سے گزر جاتے لوگ انھیں دیکھتے رہ جاتے۔ اس مردانہ حُسن و وجاہت کو آغا صاحب کی رنگین مزاجی نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ بے حد خوش گفتار، اس پر غضب اُن کی شاعری کی دھوم۔ لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اور جس محفل میں آغا صاحب بیٹھ جاتے وہاں پھر کسی کو بھی دم مارنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اُن کا اندازِ گُل افشانیٔ گفتار سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتا تھا۔ شعر خوانی کا انداز بھی سب سے جُداگانہ تھا۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ جس نے فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کو نہ سُنا ہو، افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش کو سُن لے۔

داغ تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ہاں آغا صاحب کو متعدد بار مشاعروں میں سُننے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ ان سے بہتر تحت اللفظ میں نے کسی کو پڑھتے نہیں دیکھا۔ آواز میں وہ کڑک دھمک تھی کہ بڑے سے بڑے مشاعرے میں بھی اُن کی آواز آخر تک پہنچ جاتی تھی۔ (اس زمانے میں مائیکروفون نہیں تھا) اپنا کلام سُنانے سے پہلے آغا صاحب اپنے اُستاد کے دو ایک شعر تبرکاً ضرور سُنایا کرتے تھے۔ شعر کی ادائگی اس طرح کرتے تھے کہ خود شعر کی تفسیر بن جاتے تھے۔ اُن کا لب و لہجہ شعر کے نفسِ مضمون

سے اس قدر ہم آہنگ ہوتا تھا کہ شعر میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور سُننے والے تڑپ اُٹھتے تھے۔

آغا صاحب کی آشفتہ مزاجی اور سیماب وشی انھیں چین سے کہیں بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ ابھی دلّی میں ہیں، ابھی لاہور میں، ابھی حیدرآباد دکن میں ہیں ابھی جھالاواڑ میں۔ ابھی بمبئی میں ہیں اور ابھی کلکتے میں۔ دلّی دلّی والوں کو کم ہی راس آتی ہے۔ آغا صاحب بچپن ہی میں گھر سے نکل گئے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد گھر کا ماحول بگڑ چکا تھا۔ آغا صاحب ہمیشہ کے لیے نوکیلے تھے۔ بھلا سوتیلی ماں کے طعنے تشنے ٹھنڈے پیٹوں کیسے سہہ لیتے؟ گھر سے نکلنے کے بعد بہت تکلیفیں اٹھائیں مگر نامساعد حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرتے رہے۔ اُسی زمانے میں ہی ان کی شاعری نے پر پُرزے نکالے اور اہلِ ذوق اُن کی قدر دانی کی طرف مائل ہوئے۔ خوب جوان تھے جب کچھ عرصے کے لیے اپنے اُستاد کے پاس حیدرآباد چلے گئے تھے۔ اُستاد کی قربت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ فصیح الملک کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تھی مگر اُستاد کا رنگ جتنا چوکھا آغا صاحب کی شاعری میں آیا، ان کے اور کسی شاگرد کو میسر نہیں ہوا۔ وہی شوخی، وہی چلبلا پن، وہی معاملہ بندی، وہی سادگی، وہی بے ساختگی آغا صاحب کے کلام میں بھی دیکھیے۔ دلّی کا روزمرّہ اور چٹخارہ اپنے اُستاد کی طرح آغا صاحب کا بھی امتیازی وصف ہے۔ ہونٹوں نکلی، کوٹھوں چڑھی۔ ادھر داغ نے غزل کہی اور ادھر اربابِ نشاط کے کمروں اور کوٹھوں پر پہنچی۔ یہی کیفیت آغا صاحب کی غزلوں کی بھی تھی کہ محفلیں اور مجرے اُن سے گونجتے رہتے تھے۔ میرے بچپن میں یہ غزل ہر محفلِ نشاط میں گائی جاتی تھی، مطلع تھا ؎

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

یہ غزل میں نے حیدرآباد میں بھی سُنی تھی اور دلّی میں بھی، اور اتنی بار سُنی تھی کہ اس کے کئی شعر مجھے یاد ہو گئے تھے۔ کوئی پچیس سال کے بعد اتفاقاً معلوم ہوا کہ یہ غزل آغا صاحب کی ہے۔ اگر مُلّا واحدی صاحب اپنی زندگی کا ایک واقعہ تحریر نہ فرماتے تو شاید مجھے اس کا علم بھی نہ ہوتا کہ یہ غزل کس کی ہے۔ اپنی جان میں اسے داغ ہی سے منسوب کیے رہتا۔ واحدی

صاحب نے اس غزل کی شانِ نزول بھی اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں لکھ دی تھی۔

دکن میں آغا صاحب مہاراجہ کرشن پرشاد کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے یہاں انھیں ہر قسم کا آرام میسّر تھا مگر دلّی کی یاد نے دل میں چٹکی لی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے۔ آغا صاحب اپنی آشفتہ مزاجی سے مجبور تھے۔ ساری عمر کہیں بھی ٹِک کر نہیں رہے۔ عجیب توکّل کے بندے تھے۔ لگی لگائی روزی پر لات مار کر الگ ہو جاتے تھے۔ ابھی کسی رئیس کی مصاحبت میں ہیں اور ابھی اس سے اُکتا کر کسی اخبار میں کام کرنے لگے۔ وہاں سے جی گھبرایا چھوڑ چھاڑ کر کلکتے چلے گئے اور تھیئٹر کے ڈرامے لکھنے لگے۔ آغا محمد شاہ حشر نے اس صنف میں اُن کا لوہا مانا، اور آغا شاعر کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ اپنا نام مختصر کر کے آغا حشر لکھنا شروع کر دیا۔

آغا صاحب کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ دُنیا ہی سے بے زار ہو گئے تھے۔ گلے میں گیروا کفن ڈالے ننگے سر پھرنے لگے تھے۔ ایک دن بستی نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی کے ہاں پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب نے آغا صاحب کی طرح دار جوانی دیکھی تھی، اور انھیں کینچلیاں بدلتے بھی دیکھا، اب جو انھیں اس چولے میں دیکھا تو بے اختیار خواجہ صاحب کے مُنھ سے نکلا۔ "آیئے دِل دار شاہ دا آیا۔" اس کے بعد خواجہ صاحب سے اُن کی گاڑھی چھنی اور خواجہ صاحب ہی کے کہنے پر متھرا گئے اور ویدانت کی تعلیم حاصل کی۔ مگر بھلا ہو آشفتہ مزاجی کا، کچھ دنوں بعد ترکِ دُنیا ترک کر کے پھر دُنیا کے ہنگاموں سے نبرد آزمائی کرنے لگے۔

آغا صاحب نے کسی مدرسہ سے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ زبان تو اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ جامع مسجد کے چوک نے اُسے اور بھی بنا سنوار دیا تھا۔ طباع اور ذہین آدمی تھے۔ انھوں نے جو کچھ سیکھا، نا مساعد حالات سے سیکھا۔ ناساز گار زمانے سے سیکھا کسی کے کہنے سُننے سے نہیں، اپنی کش مکش اور جِدّ و جُہد سے سیکھا اور ایسا سیکھا کہ شہرت اور نیک نامی حاصل کی۔ شہرت پر ایک واقعہ یاد آیا۔ آغا صاحب سے جب پہلی بار مجھے شرفِ مُلاقات حاصل ہُوا (اور اب اس بات کو رُبع صدی ہو گئی) تو آغا صاحب نے فرمایا تھا۔ "کبھی جوانی میں دِلّی کے

ایک جوہری کے سلسلے میں ایک مضمون میں میں نے "جھینپنے" کا لفظ لکھ دیا تھا، اس نے مجھ پر اہانت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اُس وقت میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا۔ ڈپٹی صاحب بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ انھیں دکھائی بھی کم دینے لگا تھا۔ میں نے نام عرض کیا۔ فرمایا۔ "اوہو، تمھاری شہرت تو میرے کانوں میں گھُسی جا رہی ہے۔" میں نے غرض بیان کی تو متبسّم ہُوئے۔ کہا۔ "تم نے جوہری کی رعایت سے "جھینپنا" لکھا۔ اس سے ہتکِ نہیں ہوتا۔" عدالت میں میں نے ڈپٹی صاحب کی سند پیش کی اور مقدمہ خارج ہو گیا۔"

نظم میں تو آغا صاحب اپنے ہم عصروں میں سرِ فہرست تھے ہی، نثر میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ دِلّی کی ٹکسالی زبان اور ٹھیٹ ہِندُستانی محاورے لکھتے تھے۔ انھوں نے بے شمار مضامین لکھے، ناول لکھے، ڈرامے لکھے، مگر افسوس کہ اب ان میں سے کوئی دستیاب نہیں ہوتا۔ انھوں نے ایک رسالہ "آفتاب" بھی کئی سال تک نکالا تھا۔ وہ بھی ماضی کے اندھیروں میں ڈُوب گیا۔ خواجہ حسن نظامی جیسے انشا پرداز کو آغا صاحب کی نثر کے فقرے ازبر تھے۔

آغا صاحب نے اپنی زندگی میں ہزاروں نہیں لاکھوں شعر کہے اور یقیناً ان کے کئی مجموعے بھی چھپے ہوں گے مگر افسوس کہ انھوں نے کوئی دیوان خاص اہتمام سے شائع نہیں کیا۔ اُن کے مشہور شاگردوں اور بھائیوں میں سے نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی نے "کشکولِ سائل" شائع کیا۔ منشی وحید الدین بیخود دہلوی نے "دُرِّ شہوارِ بیخود" شائع کیا۔ نوح ناروی نے "طوفانِ نوح" شائع کیا۔ آغا صاحب کی آشفتہ مزاجی اور لاابالی پن نے انھیں اپنے کلام کی تدوین کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

آغا صاحب کو ترجمہ کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ رُباعیاتِ عمر خیّام کے منظوم ترجمے کئی دیکھنے میں آئے مگر آغا صاحب کے ترجمے سے کِسی کا ترجمہ لگّا نہیں کھاتا۔ انگریزی میں فٹز جیرلڈ کے ترجمے کو عالم گیر شہرت حاصل ہے، مگر اسے تو سرے سے ترجمہ کہنا ہی غلط ہے۔ اُسے اخذ، ماخوذ جو جی چاہے کہہ لیجیے، ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔ اُردو میں بہترین ترجمہ آغا صاحب ہی کا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آغا صاحب کے گھر میں فارسی اُسی بے تکلفی سے بولی جاتی ہے جیسے اُردو، لہٰذا فارسی کی فہم جتنی انھیں تھی کم لوگوں کو تھی۔ رہی اُردو، تو وہ گھُٹی میں پڑی تھی۔ شاعر وہ پیدا ہی

daasarulkutub.blogspot.com

ہوئے تھے، بھلا اُن سے بازی کون لے جاتا ہے؟

آغا صاحب کا ایک اور کارنامہ اُن کا منظوم ترجمۂ کلام مجید ہے۔ جس کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی نے آغا صاحب کو لکھا تھا۔ "آپ نے کلام اللہ کو نظم کر لیا۔ اب کوئی اللہ کا بندہ اسے طبلے اور سارنگی پر گا بھی دے تو مزا آجائے گا۔" خیر یہ تو مذاق کی بات تھی حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب سے پہلے اور آغا صاحب کے بعد بھی چند اور قادر الکلام شعرا نے کلام مجید کے منظوم ترجمے کیے ہیں۔ مگر آغا صاحب کا ترجمہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ بے شک آغا صاحب افسر الشعرا تھے۔ شاعری کے تاجدار تھے۔ یہ ترجمہ اُن کا لازوال کارنامہ ہے اور اُن کی مغفرت کا ذریعہ۔

آغا صاحب کی جوانی پر تو دُنیا کو رشک آتا تھا۔ ادھیڑ عمر بھی اچھی خاصی گزری مگر بڑھاپا خراب ہو گیا۔ جس ریاست میں آغا صاحب کی کمان چڑھی ہوئی تھی اُس کا رئیس مر گیا۔ اور آغا صاحب دل برداشتہ ہو کر دِلّی چلے آئے۔ اُس وقت وہ ستّر کے پیٹے میں آچکے تھے۔ صحت نے جواب دے دیا تھا اور ناداری نے چھاؤنی چھائی تھی۔ کچّا سا مکان تھا۔ بچّے کمانے دھمانے کے لائق نہیں ہوئے تھے۔ آغا صاحب کے دوست احباب اور قدر دان بہت کچھ دُنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ آغا صاحب کی آنکھ کا آنسو کسی وقت نہیں تھمتا تھا۔ جامع مسجد کو دیکھتے تو ہائے کا نعرہ لگاتے اور آنکھوں سے لڑیاں بندھ جاتیں۔ کسی پُرانے خاندان کے فرد کو دیکھتے تو گلے لگا کر سسکیاں بھرنے لگتے۔ دِلّی اور دِلّی والوں کا غم انھیں کھائے جاتا تھا۔ یہی دِلّی تھی جس میں آغا کا طوطی بولتا تھا۔ اب وہی بھری پُری دِلّی اُن کے لیے ویران ہو چکی تھی۔ ہر وقت چہکنے والا طوطی منقار زیرِ پر تھا۔ آغا صاحب جتنے طرح دار اور وضع دار تھے، اتنے ہی غیور بھی تھے۔ کسی سے امداد قبول نہیں کرتے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا گزارہ کیسے ہوتا تھا۔ دِلّی میں ان کے اعجاز کے بہت سے قصّے مشہور تھے۔ مثلاً ایک قصّہ یہ سننے میں آیا کہ اجمیر شریف کے عرس میں اُن کی جیب میں سے دو سو روپے کہیں گر گئے۔ سخت پریشان تھے کہ اُن کے ایک دوست مل گئے۔ انھوں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" آغا صاحب نے کہا۔ "دِلّی جاؤں گا۔" بولے۔ "یہ دو سو روپے میرے گھر دے دینا۔" آغا صاحب نے روپے لے لیے اور بلا ٹکٹ

ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ریل فرّاٹے بھر رہی تھی کہ ایک ہاتھ کھڑکی میں سے اندر آیا۔ اُس میں آغا صاحب کا بٹوہ تھا۔ آغا صاحب نے بٹوا لے لیا اور کھول کر دیکھا۔ اُس میں دو سو روپے بھی موجود تھے اور ٹکٹ بھی۔ اور جب دوست کے گھر جا کر کنڈی بجائی تو دوست صاحب خود گھر میں سے نکلے چلے آئے۔ آغا صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ "آپ؟ آپ تو اجمیر شریف میں تھے۔" اُنھوں نے کہا۔ "میں تو یہیں ہوں، اجمیر کیسا؟" آغا صاحب نے کہا۔ "آپ وہاں بازار میں ملے، یہ دو سو روپے آپ نے مجھے گھر پہنچانے کے لیے دیے۔" دوست نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا کہ آغا صاحب کسی اور عالم میں تو نہیں ہیں؟ مگر وہاں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ کہا۔ "آپ کو دھوکا ہوا، نہ تو میں اجمیر گیا اور نہ میں نے آپ کو روپے دیے۔"

آغا صاحب نے جب جوگ لے لیا تھا تو اُس زمانے میں بھی کچھ غیر معمولی باتیں اُن سے ظہور میں آنے لگی تھیں اور شاید انھیں سے گھبرا کر آغا صاحب نے جوگ کو تج دیا تھا۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ بُرے وقت میں غیب ہی سے آغا صاحب کی امداد ہوتی تھی، کسی بندے بشر کا منہ نہیں تکنا پڑتا تھا کہ انھیں کچھ دے ؎

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

آغا صاحب کا آخری وقت دِلّی میں اپنے گھر پر ہی گزرا۔ اور ایک دن سُنا کہ آغا صاحب قیدِ حیات سے چھوٹ گئے۔ اچھے آدمی تھے، اچھی گزار گئے۔ جانا سبھی کو ہے ؎

آج وہ کل ہماری باری ہے

بڑی ناحق شناسی ہوگی اگر بیگم آغا کا ذکر نہ کیا جائے۔ ایسی صابر و شاکر خاتون کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آغا صاحب کی زندگی جس مشکل سے گزری اُس کی ایک جھلک آپ نے دیکھ لی۔ بیگم آغا ہی نے اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت کچھ اِس ڈھب سے کی کہ آج بفضلہ تینوں لڑکے برسرِ روزگار اور خوش حال ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی اپنے گھر بار کی ہے۔ شعر گوئی سب کو ورثے میں ملی ہے۔ مگر سب سے زیادہ اُس لڑکی کو جو [illegible] تخلص کرتی ہے۔

qasarulkutub.blogspot.com

اپنے نامی گرامی باپ کی طرح نثر بھی خوب لکھتی ہیں ماشاءاللہ۔ ان چاروں بہن بھائیوں سے مِل کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ دِلّی کا روایتی حُسنِ اخلاق، بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ، خوش خُو، خوش کلام، خوش صفات، یہ عطیہ ہے بیگم آغا کا۔

آغا سرخوش سنجھلے صاحب زادے ہیں۔ شعر خوب کہتے ہیں مگر سُناتے نہیں۔ نمُود سے گھبراتے ہیں۔ رسالہ چمنستان دِلّی سے نکالا تھا جو کئی سال تک چلتا رہا۔ کراچی آ کر بھی اسے جاری رکھا، مگر ناہموار حالات کی بادِ سموم میں ادب کا یہ چمن اُجڑ گیا۔ آغا صاحب کی دو چار کتابیں بھی چھاپ چُکے ہیں۔ اب انھوں نے ایک مجموعہ مضامین مرتّب کیا ہے، جس میں وہ تمام مضامین جمع کیے ہیں جو آغا صاحب پر لکھے گئے۔ لکھے تو اس سے بھی کہیں زیادہ گئے ہیں، مگر جتنے انھوں نے یک جا کر لیے ہیں، یہ بھی بہت قابلِ قدر ہیں۔ زمانہ زُود فراموش اور بڑا ناگُنا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے آغا صاحب کی ایک یادگار تو قائم ہو سکے گی۔ اُن کی سعادت مندی سے توقع بھی یہی تھی۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکُن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

۱۹۶۶ء

کرشن چندر

تیس سال سے زیادہ ہی ہو گئے کہ "ادبی دُنیا" اور "ہمایوں" میں ایک نئے ادیب نے افسانے لکھنے شروع کیے۔ ان افسانوں کا انداز اتنا دِل کش ہوتا تھا کہ پڑھنے والے اُن کے لیے چشم بہ راہ رہنے لگے۔ یہ افسانہ نگار تھا — کرشن چندر۔ جس نے اپنے پہلے افسانے ہی سے ہر دِل عزیزی حاصل کر لی تھی۔ یہ شرف کسی کسی ہی کو نصیب ہوتا ہے ؏

قبولِ خاطر و لُطفِ سُخن خُداداد است

قیامِ پاکستان سے پہلے دِلّی، لاہور گھر آنگن تھا۔ رات کو کھانا دِلّی کھا کر فرنٹیئر میل میں جا سوئے اور صبح جو آنکھ کھُلی تو لاہور۔ دِلّی کے بعد سب سے زیادہ دخل میری زندگی میں لاہور ہی کو رہا ہے تعلیمی اعتبار سے لاہور اُس زمانے میں ہندوستان میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو ولایت میں کیمبرج یا آکسفورڈ۔ اس وقت فیشن کے لحاظ سے لاہور کو ہندوستان کا پیرس سمجھا جاتا تھا۔ اور واقعی میں شام ہوتے ہی لاہور کی مال پر قدِ آدم قیامتیں برپا ہو جاتی تھیں۔ اب یہ لاہور بھی مہک کر کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے

کل جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

ہاں تو اس لاہور میں میری کالج کی تعلیم کے چار سال گزرے۔ پھر چند سال بعد جب میں نے "ساقی" شائع کرنا شروع کیا تو لاہور کے سال میں کئی کئی پھیرے ہوتے تھے۔ لاہور کی علمی و ادبی زندگی اپنے عروج پر تھی۔ رسالوں میں نیرنگِ خیال، عالمگیر، ہمایوں، ادبی دُنیا اور شاہکار اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یہ شہر ادب کی منڈی اور ادیبوں کی کان تھا۔ اس شہر میں دو چار نہیں، دس بیس نہیں، سیکڑوں شاعر اور ادیب رہتے تھے۔ اگر میں صرف اُن کے

qasrulkutub.blogspot.com

نام گنانا شروع کروں تو کئی صفحے بھر جائیں گے۔ اُس زمانے کو ہر لحاظ سے لاہور کا سُنہرا زمانہ کہنا چاہیے۔ لاہور کی وہ طرفگی اس کے بے مثل بسنے والوں کے باعث تھی۔ وہ لوگ ہم سے رخصت ہوئے اور اس شہر کی شان و شوکت بہت کچھ اپنے ساتھ لے گئے ؎

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

دُوسری عالمگیر جنگ سے چند سال پہلے اس لاہور میں لکھنے والوں کی ایک اور کھیپ آئی جس میں میرا جی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک ایک دم سے چمک اُٹھے۔ علامہ تاجور سے "ادبی دُنیا" مولانا صلاح الدین احمد نے خرید لیا تھا۔ مولانا کی مقناطیسی شخصیت کے گِرد نئے ادیبوں اور شاعروں کا ایک حلقہ اسی طرح بن گیا تھا جیسے چاند کے گرد ہالہ۔ مولانا خود صاحبِ طرز ادیب تھے مگر بہت کم لکھتے تھے۔ ہاں بہت اچھے ادیب گر تھے۔ نئے لکھنے والوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اور جس میں ذرا بھی جان دیکھتے لکھنے میں اس کی راہ نمائی کرتے اور اُس کے مضامین کی اصلاح کر کے "ادبی دُنیا" میں چھاپتے۔ "ادبی دُنیا" میں کسی کے مضمون کے چھپ جانے کا یہ مطلب تھا کہ وہ لکھنے والا مُستند ادیب بن گیا۔ مولانا کی خوش مزاجی اور اُن کی مُونچھوں میں چھپی ہوئی دائمی مسکراہٹ نئے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ مولانا بڑی محبّت و خلوص سے انھیں ادب و انشا کے نکات سمجھاتے اور اُلٹی اُن کی خاطر تواضع کرتے۔ اس موانست کے باوجُود مولانا کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے بے تکلّف ہو جائے۔ مولانا انھیں ایک "محترم فاصلے" پر رکھنا خُوب جانتے تھے۔ لہٰذا سبھی مولانا کا ادب کرتے اور انھیں اپنا شفیق بُزرگ سمجھتے تھے۔

مولانا کی ادارت میں "ادبی دُنیا" اپنے عروج پر تھا کہ حسبِ معمُول میں ایک سال لاہور گیا۔ مولانا کو خبر ہوئی تو مجھے اپنے دفتر میں شام کی چائے پر بُلایا۔ مولانا سے تنہائی میں خُوب کھُل کر باتیں کرنے کے ارادے سے جب میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں اُن کے احباب کا ایک خاصا بڑا مجمع لگا ہُوا ہے۔ مولانا نے فرداً فرداً سب کا مجھ سے تعارف کرایا۔ جب اُنھوں

نے کرشن چندر کا نام لیا تو میرا دل زور سے دھڑکا اور میں نے بڑی گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملایا۔ یہ کرشن چندر میرے تصوّر کے کرشن چندر سے بہت مختلف نکلے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ چھ فٹے لمبے تڑنگے بڑے چرب زبان جوان ہوں گے۔ مگر وہ کسی قدر پستہ قد اور خاموش آدمی تھے۔ چہرے سے سنجیدگی اور بُردباری ٹپکتی تھی۔ بولتے کم تھے مگر دُوسروں کی باتوں پر مُسکراتے۔ وہ ہنستے زیادہ تھے۔ پہلی ملاقات میں اُن سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ واپس دِلّی آنے کے بعد ان سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا اور انھوں نے "ساقی" کے لیے ایک افسانہ "نیلی شلوار" بھی بھیجا۔ خطوں سے بہت مخلص آدمی معلوم ہوتے تھے اور بعد میں میں نے انھیں سرتاپا اخلاص پایا۔

جب دُوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو کئی ادیبوں کی قسمت کھُلی۔ وہ یوں کہ آل انڈیا ریڈیو کو بڑے پیمانے پر پروپیگنڈا کرنے کی ضرورت محسُوس ہوئی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد ایک ایک کر کے کئی بڑے ادیب اس خدمت کو انجام دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل تھے جو کھُلم کھُلا کمیونسٹ تھے، اور وہ بھی جو فرنگی راج کے شدید مخالف تھے اور بعض نے تو حد ہی کر دی کہ جھٹ کینچلی بدل کر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مجید ملک، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، عارف، چراغ حسن حسرت اور بدر الدین بدر، کرنل، میجر اور کپتان بن گئے۔ ریڈیو کی ملازمت قبول کرنے والوں میں کرشن چندر، بیدی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، محمود نظامی، انصار ناصری، شوکت تھانوی، سریندر ناتھ چٹو پادھیا (سروجنی نائیڈو کے بھائی)، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر محمود حسین، راز مُرادآبادی، حامد علی خاں اور میرا جی تھے۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) تو ڈائرکٹر جنرل ہی تھے۔ ان میں سے دو ایک کے سوا باقی سب دِلّی ہی میں تھے۔ اسی زمانے میں مجھے ان سب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا۔ پیسے کی فراوانی نے بڑے بڑوں کے حواس کھو دیے تھے۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑ گیا تھا، نتیجہ معلُوم!

مگر جنھوں نے اپنی سنجیدگی اور بُردباری کو نہیں چھوڑا اور اپنی اگلی روش ہی پر قائم رہے اُن میں سے ایک کرشن چندر تھے۔ دِلّی آتے ہی وہ ایک شام کو کتب خانہ علم و ادب اردو بازار میں مجھ سے مِلنے آئے۔ جس تکلّف سے پہلے دن مِلے تھے، آخری دن تک اسی تکلّف سے مِلتے رہے۔

qasrulkutub.blogspot.com

ساتھ اُٹھنا بیٹھنا بہت رہا۔ مَیں اُن کے ہاں اور وہ میرے ہاں کھانے میں اکثر شریک ہوتے رہے لیکن تکلّف کی حد برابر قائم رہی۔ وہ لیے دیے رہتے تھے اور کم گو تھے۔ اُن میں ایک وقار تھا جو اُن کی عزّت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ خفیف الحرکتی اور اوچھا پن ان میں نام کو نہیں تھا۔ اُن کے ملنے کا انداز بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ اوروں کی زبانی اُن کے بارے میں بُری بُری باتیں سُنیں۔ اِس کان سُنیں اُس کان اُڑا دیں۔ یار کی یاری سے غرض، یار کے فعلوں سے کیا کام؟ نفیس انگریزی لباس پہنتے تھے۔ دھوتی پہنے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ اُن کے افسانوں میں سے بُوئے پوری کچوری آتی تھی اور نہ تنو دانی میں سے۔

ریڈیو کے افسر کرشن چندر سے کچھ خوش نہیں تھے۔ کیوں کہ انھیں چاپلوسی اور خوشامد کرنی نہیں آتی تھی۔ انھیں اپنے کام سے کام تھا۔ دفتری فرائض وہ پوری جاں فشانی سے انجام دیتے تھے۔ اس کے بعد افسروں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ اپنا جی بہلاتے تھے اور اپنے آپ میں مگن رہتے تھے۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے اُوپر والوں کو یہ بدگمانی ہو چلی تھی کہ کرشن چندر بہت مغرور آدمی ہے۔ ہم نے اسے ریڈیو میں جگہ دی ہے اور یہ ہمیں کو گھاس نہیں ڈالتا۔ ہمارے متوسّلین تو ہم سے ملنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں اور کرشن چندر ہے کہ ہم سے دُور ہی دُور رہتا ہے۔ افسروں کی اِس شکایت کا علم کرشن چندر کو بھی ہو گیا تھا مگر انھوں نے اِس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ کسی نے اگر انھیں جتایا بھی تو انھوں نے صاف جواب دے دیا کہ میرا اُن سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تو مَیں ان سے کیوں ملوں؟ نتیجہ یہ کہ ان کے بعض خوشامدی ساتھیوں کو ترقی مل گئی اور کرشن چندر پروگرام اسسٹنٹ کے پروگرام اسسٹنٹ ہی رہے۔

ایک دفعہ ان کے ہم چشموں نے انھیں بہت سمجھایا بجھایا کہ پطرس ڈائرکٹر جنرل ہی نہیں ہے، بہت بڑا ادیب اور ادیبوں کا قدر دان بھی ہے۔ اگر تم ان سے مل کر دو باتیں کر لو تو اس میں کیا حرج ہے؟ وہ اچھے آدمی ہیں۔ سب سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ تم سے مل کر خوش ہوں گے اور تم بھی ان سے مل کر خوش ہوگے۔ لوگوں نے ناحق انھیں ہوّا بنا رکھا ہے۔ تم جا کر تو دیکھو۔ غرض یاروں نے گونتھ گانٹھ کے کرشن چندر کو آمادہ کر لیا اور ایک دن کئی زینے طے کر کے کرشن چندر ڈائرکٹر جنرل کے کمرے کے آگے جا کھڑے ہوئے۔ چپراسی کے ہاتھ اپنے نام کی پرچی اندر بھیجی۔ فوراً بلا لیے گئے۔ جا کر

آداب عرض کیا اور کھڑے رہے۔

پطرس (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) "تشریف رکھیے۔"

کرشن چندر: "جی" (بیٹھ گئے)۔

(خاموشی)

پطرس: "فرمائیے؟"

کرشن چندر: "جی ——— جی آپ ——— آپ بڑے اچھے ہیں۔"

پطرس: (مسکرا کر) "مَیں آپ کی بات سمجھ گیا۔ ٹھیک ہے۔"

کرشن چندر: (کھڑے ہوتے ہوئے) "اجازت ہے؟"

پطرس: "ضرور ضرور۔"

ملاقات ختم ہو گئی۔ کرشن چندر باہر آئے تو جیسے ان پر سو جوتے پڑ گئے ہوں۔ لڑکھڑاتے ہوئے زینے پر سے اُترے۔ احباب ان کے منتظر ہی تھے، ٹوٹ پڑے۔ "کیا ہوا ــ کیا ہوا؟" ناراض ہو کر بولے۔ "ہونا کیا؟ کہا تھا کہ مجھے مت بھیجو۔ مگر آپ لوگ مانتے نہیں۔" پوچھا "آخر ہوا کیا؟" ——— بولے: "یہ ہوا!" سب نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ کرشن چندر بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے باعث بہت جلد شہرت حاصل کر لی تھی مگر انھیں نہ تو اپنی شہرت کی پروا تھی اور نہ مقبولیت کا زُعم۔ اُن کی کسی بات سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا کہ انھیں اپنی بڑائی کا پندار ہے۔ باتیں بھولی بھولی کرتے اور نظریں جھکائے رہتے۔ اُن کی تحریر جتنی جان دار ہوتی تھی، اُن کی گفتگو اتنی ہی بے جان ہوتی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مگر بات چیت میں مغربی مصنّفین کے حوالے دے کر سننے والوں کو مرعوب نہیں کرتے تھے۔ اُن کی آواز نیچی اور لہجہ متین ہوتا تھا۔ جو بات کہنی ہوتی، سیدھے سبھاؤ کہہ دیتے۔ مَیں نے اُن کی زبان سے عربی یا فارسی کا کوئی مشکل لفظ کبھی نہیں سُنا۔ اُردو بولتے تھے تو اُردو ہی بولتے تھے۔ اس میں انگریزی نہیں ملاتے تھے اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ کئی سال کی یکجائی کے باوجود انھیں انگریزی بولتے کبھی نہیں دیکھا۔ حالاں کہ وہ انگریزی ہی کے ایم اے تھے اور انھوں نے

qasarulkutub.blogspot.com

لاہور کے فورمن کرسچین کالج میں پڑھا تھا جس کے پروفیسر امریکن تھے۔ مگر لکھنے کے معاملے میں انگریزی بھی اتنی ہی خوب صورت لکھتے تھے جیسی کہ اُردو۔

کرشن چندر نام و نمود سے گھبراتے تھے۔ وہ شہرت سے بھاگتے تھے اور شہرت ان کے پیچھے بھاگتی تھی۔ نمود سے گریزاں ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں دُوسری عالمگیر جنگ زور پکڑ رہی تھی اور جاپان نے برما پر قبضہ کرنے کے بعد کلکتہ پر بھی دو چار بم گرا دیے تو کرشن چندر کے دِل میں یہ آئی کہ اَب واقعی ہندوستان کے سب ادیبوں کو اپنی پالیسی بدل دینی چاہیے۔ اب تک تو انگریز دشمنی تھی اور ہندوستانی جرمنی اور جاپان کی پیش قدمیوں پر دِل ہی دِل میں خوش ہوتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ دشمن کا دشمن دوست۔ لیکن جاپان کی جارحانہ حرکت نے باور کرا دیا کہ یہاں معاملہ برعکس ہے، یعنی دشمن کا دشمن بھی دشمن۔ لہٰذا ہماری خیر اسی میں ہے کہ سب کو اپنا دشمن سمجھیں اور صرف اپنی خیر منائیں۔

ایک دن کرشن چندر نے بڑی رازداری سے مجھ سے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے تمام زبانوں کے معرُوف ادیبوں کا ایک کنونشن دِلّی میں بُلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں پُورے ہندوستان کے ادَب کا رُخ کیا ہونا چاہیے۔ پھر ہمیں چند ضروری قرار دادیں منظور کرانی ہوں گی۔ میں نے کہا: "تو یہ جلسہ ضرور بُلانا چاہیے۔ آپ پیشوائی کیجیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" بولے: "نہیں، کنوینر آپ ہوں گے اور واتسیاین" میں نے پوچھا: "یہ واتسیاین کون صاحب ہیں؟ کیا مدراسی ہیں؟" کہا: "ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔" میں نے کہا: "کنوینر تو آپ کو ہونا چاہیے۔ آپ کو اُردو والے بھی جانتے ہیں اور ہندی والے بھی۔" بولے: "مگر آپ غیر جانب دار ادیب ہیں اور ایڈیٹر ہیں، اور دِلّی ہی کے رہنے والے ہیں اور حکومت کے ملازم بھی نہیں ہیں۔ اس کام کے لیے آپ سے موزُوں آدمی نہیں اور کوئی نہیں مِل سکتا۔" اپنی تعریف سُن کر سبھی پھُول جاتے ہیں، میں بھی پھُول گیا اور جھٹ رضامند ہوگیا۔ ایک ہفتے ہی میں کنونشن کا پروگرام چھپ کر آگیا، اور دعوت نامے بھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اخراجات کے لیے روپیہ کہاں سے آیا؟ کس کو کیا دیا؟ سارے کام سُدھ کیسے ہوتے چلے گئے؟ دو ہفتے بعد بھانت بھانت کے مہمان ادیب آنے

شروع ہوگئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھیں کہاں ٹھہرایا گیا۔ سو سے کیا کم ہوں گے۔ بیشتر اپنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرے تھے۔ ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں دو دِن تک شان دار جلسہ ہُوا۔ دُھواں دھار تقریریں ہُوئیں، پیپر پڑھے گئے اور قرار دادیں منظور کی گئیں۔ میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ سب کام بغیر کسی پریشانی کے ہوتے چلے گئے۔ سب نے مجھے جلسے کی کامیابی کی مبارکباد دی۔ میں دِل ہی دِل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ کرشن چندر کی محنت کا پھل مجھے مِل رہا ہے۔ کرشن چندر کھِلے جاتے تھے اور میری تعریف کے پُل باندھے جاتے تھے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑتا رہا اور میں کھسیانی ہنسی ہنستا رہا۔ بعد میں میں نے کرشن چندر سے کہا کہ "آپ نے اس جلسہ کی کامیابی اور نیک نامی کا سہرا میرے سر باندھ دیا۔ سارا کام تو آپ نے کیا اور نام میرا ہوگیا۔" مُسکرا کر بولے۔ "سب ٹھیک ہے، اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیے۔" اور میں نے آج تک اس کا ذِکر کسی سے نہیں کیا تھا، مگر اب میں مناسب سمجھتا ہُوں کہ اس راز کو افشا کردُوں تاکہ حق حق دار کو پہنچ جائے۔

کرشن چندر بڑے خرچیلے آدمی تھے۔ تنخواہ کے ڈھائی تین سو روپے شاید دس دن بھی نہیں چلتے ہوں گے۔ کتابیں لکھتے تھے یا مرتّب کرتے تھے۔ اور لاہور سے اُن کی کتابیں چھپتی رہتی تھیں۔ اُن کی آمدنی سے وہ اپنے اخراجات پُورے کرتے تھے۔ ایک دِن شام کو کتب خانہ علم و ادب پر آئے۔ احباب حسب معمول جمع تھے۔ کرشن چندر عموماً تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جایا کرتے تھے مگر اس دِن جمے رہے، اور پہلو بدلتے رہے۔ جب دکان بند ہونے لگی اور سب اپنے اپنے گھر جانے لگے تو کرشن چندر نے مجھ سے کہا: "آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "فرمایئے۔" بولے: "آپ ان سب سے رخصت ہولیں تو کہیں چلیں۔" میں اُن کے ساتھ ہولیا۔ انھوں نے ایڈورڈ پارک کا رُخ کیا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے مچھلی والوں میں سے گزر گئے۔ کرشن چندر جب کچھ نہ بولے تو میں نے کہا: "فرمایئے، کیا بات ہے؟" بولے: "میں ساقی بُک ڈپو کے لیے ایک ناول لکھنا چاہتا ہُوں۔" میں نے کہا: "ضرور لکھیے، اس سے اچھّی اور کیا بات ہوسکتی ہے؟" ہنس کر بولے: "مگر اس کے لیے مجھے کشمیر جانا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تو جایئے۔" کہا: "میں چاہتا ہُوں کہ آپ اس ناول کا کاپی رائٹ مجھ سے لے لیں۔" کرشن چندر کو معلوم تھا کہ جب سے ایک معرُوف ادیب نے اپنی ایک کتاب کی رائلٹی کے سلسلے میں مجھ سے

qasrulkutub.blogspot.com

بدگمانی کی تھی۔ میں نے رائلٹی پر کتابیں چھاپنے سے توبہ کر لی تھی اور دائمی حقوق خریدنے شروع کر دیے تھے۔ لہٰذا کرشن چندر نے کاپی رائٹ خریدنے کی پیشکش کی تھی۔ اب گھبرانے کی میری باری تھی کہ اتنا بڑا اور مقبول مصنف نہ جانے کیا مانگ بیٹھے؟ میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ "آپ کیا قبول کریں گے؟" بہت ہچکچاتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "کیا آپ مجھے اس کے لیے ایک ہزار روپے دے دیں گے؟" میری ساری گھبراہٹ رفوچکر ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔" پھر انھوں نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ "کیا آپ مجھے یہ روپے پیشگی دے دیں گے؟" میں نے کہا۔ "ہاں دے دوں گا۔" بولے۔ "تو جب آپ مجھے یہ روپیہ دیں گے تو میں کشمیر چلا جاؤں گا اور ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "روپیہ آپ کو کل مل جائے گا۔" بہت خوش ہوئے۔ بولے: "بس تو میں پرسوں چلا جاؤں گا۔" پچیس دن بعد وہ کشمیر سے واپس آ گئے اور مجھے اپنے ناول "شکست" کا مسودہ دے گئے۔ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ "کمال کر دیا آپ نے!" کہنے لگے۔ "روپے ختم ہو گئے تھے اس لیے میں کچھ جلدی واپس آ گیا۔" پچیس دن میں ایک ہزار خرچ کر دینے پر تو مجھے تعجب ہوا ہی تھا، اس سے زیادہ تعجب کرشن چندر کی راست معاملگی اور دیانت داری پر ہوا۔ یہ پہلے ادیب تھے جنھوں نے اپنی بات کا پاس کیا تھا ورنہ یار لوگ بڑے بڑے وعدے کر کے مجھے جھنکاتے ہی رہے۔ "شکست" کے بعد کرشن چندر نے میرے لیے "نئے افسانے" کے نام سے ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا اور اس کے بعد اپنے مختصر مضامین کا مجموعہ "گھونگھٹ میں گوری جلے" دیا۔ معاملت میں میں نے انھیں کھرا پایا۔ مول تول نہ انھوں نے کبھی کیا اور نہ میں نے۔ ان کا مطالبہ بہت معقول ہوتا تھا اس لیے سودے بازی کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔

"شکست" شائع ہوئی تو ادبی دنیا میں بھونچال سا آ گیا۔ مدتوں بعد ایک اچھے مصنف کا اچھا ناول شائع ہوا تھا۔ کچھ لوگ "شکست" کو دیکھ کر جل گئے اور کچھ رشک و حسد میں گھلنے لگے۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر ایک اوچھی تنقید لکھی۔ منٹو، اشک، فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت تک ناول لکھنے پر تل گئے، مگر سب ٹیں ٹیں فش۔ منٹو نے کہا،

"میں ضرور لکھوں گا۔" یہی کہتے کہتے بمبئی چلے گئے۔ اشک نے کہا۔ "میرا ناول کرشن کے ناول سے بہتر ہوگا۔ میں دو ہزار لوں گا اور پیشگی لوں گا۔" مجھ میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان سے معاملہ کر لیتا۔ لہٰذا یہ ناول بھی نہیں لکھا گیا۔ فیض صاحب نے چھ سو روپے پیشگی لیے اور چھ مہینے بعد لوٹا دیے کہ ناول لکھنے کی فرصت نہیں مل رہی۔ حسرت صاحب نے ناول بھی نہیں لکھا اور پیشگی رقم بھی لے کر جنوب مشرقی ایشیا چلے گئے۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد لاہور اور کراچی میں سالہا سال تک ملتے رہے مگر ناول اور پیشگی کا کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ پھر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ کالج سے نکلنے کے بعد نوکری کے خواہش مند کو اگر آل انڈیا ریڈیو میں جگہ مل جاتی تھی تو امیدوار اسے اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ باہر سے ریڈیو کی دنیا نوجوانوں کو پرستان دکھائی دیتی تھی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں ان کا یہ حسین خواب ٹوٹ جاتا اور وہ محسوس کرنے لگتے کہ ہم کس دلدل میں آن پھنسے؟ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے۔ جو نکل گیا اچھا ہی رہا، اور بعض تو بہت اچھے رہے، جیسے آغا محمد اشرف کہ آگے چل کر "ہز ایکسیلینسی" کہلائے۔ مگر یہ دوسری عالم گیر جنگ سے پہلے کا ذکر ہے۔ جنگ کے بعد فلم انڈسٹری بمبئی اور پونا میں چمک اٹھی تھی۔ کلکتہ بیٹھ گیا تھا۔ آغا حشر وہاں سے پہلے چلے آئے تھے۔ آرزو لکھنوی بھی بعد میں آ گئے تھے۔ منشی پریم چند جب اپنے چھاپے خانے کی وجہ سے بہت مقروض ہو گئے تو مجبور ہو کر بمبئی کی فلمی دنیا میں چلے گئے تھے مگر منشی جی اس میں پنپ نہ سکے اور جلد ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔ جوش ملیح آبادی جا کر ڈبلیو زیڈ احمد کی کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ ساغر نظامی بھی وہیں تھے۔ دونوں یہی کہتے تھے کہ مکالمے بھی میں لکھتا ہوں اور گانے بھی۔ خیر، ہمیں اس سے کیا کہ کون لکھتا تھا؟ ہمیں کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ بڑا ادبی جتھا فلموں کا کام کر رہا تھا۔ شاہد لطیف، انجمن ترقی اردو دلی کو چھوڑ کر بامبے ٹاکیز میں چلے گئے تھے۔ ان کے بعد عصمت چغتائی بھی پہنچ گئیں۔ احمد عباس پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دلی سے منٹو، اشک، راجہ مہدی علی خاں بھی بمبئی پہنچ گئے، اور فلمستان سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے بعد کرشن چندر اور مہندر ناتھ بھی چلے گئے۔ قیسی رام پوری، ماہر القادری اور بہزاد لکھنوی بھی فلموں کے چکر میں رہے۔ مگر دیر سویر ناکام ہو کر پاکستان آ گئے۔ شکیل بدایونی اپنی موزونی اور محتاط طبیعت کی وجہ سے جمے رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ علی سردار

جعفری اور ظ۔ انصاری بھی بمبئی میں تھے۔ نخشب جارچوی کی ایک قوالی نے اُن کا مستقبل بنا دیا تھا۔۔۔ جاں نثار اختر، میراجی اور اختر الایمان بھی قسمت آزمائی کو پہنچ گئے تھے۔ اور بھی چند حضرات ہوں گے، جن کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ غرض بمبئی میں ادیبوں اور شاعروں کا اچھا خاصا مجمع ہو گیا تھا۔ علامہ سیماب پاکستان آ گئے تھے اور اعجاز صدیقی صاحب اپنا ماہنامہ "شاعر" آگرہ سے بمبئی لے گئے تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ بمبئی میں ادیبوں اور شاعروں کے بھاگ کھل رہے تھے۔ بلانے کو تو جو بھی بمبئی پہنچ جاتا مجھے ضرور بلاتا۔ مگر شاہد لطیف اور عصمت چغتائی نے جب اپنا گھر جما لیا تو میں نے ایک ہفتہ کے لیے بمبئی جانے کی فرصت نکالی۔

دلی سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک تار شاہد لطیف کو اور دوسرا کرشن چندر کو دے دیا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ قیام شاہد لطیف کے یہاں ہوگا۔ جب میں بمبئی اسٹیشن پر اُترا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ طبیعت سخت مکدّر ہوئی۔ جی میں یہی آئی کہ اگلی گاڑی سے دلی لوٹ جانا چاہیے۔ میں ویٹنگ روم کا رُخ کر رہا تھا کہ ایک دم سے مہندر ناتھ آ کر لپٹ گئے ۔۔۔ "ارے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ بھائی نے مجھے بھیجا ہے آپ کو لینے کے لیے۔" اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ کرشن چندر نے اندھیری میں بہت بڑی کوٹھی لے رکھی تھی۔ گھر پر وہ میرے منتظر تھے، ہم بغل گیر ہوئے۔ مزاج پُرسی کے بعد پہلی بات میں نے یہی کہی کہ شاہد لطیف اسٹیشن پر لینے نہیں آئے، اس لیے میں مہندر ناتھ کے ساتھ آپ کے ہاں آ گیا۔ کرشن چندر نے کہا۔ "اگر شاہد لطیف آ بھی جاتے، تب بھی مہندر آپ کو اور انھیں یہیں لاتا۔" شام کا وقت تھا، چائے آ گئی۔ ابھی ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ شاہد لطیف آ گئے۔ گھبراہٹ اور ندامت سے بولے۔ "مجھے اسٹیشن پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ چلیے، نیچے ٹیکسی کھڑی ہے۔" کرشن چندر کچھ بولنے کو ہوئے تو میں نے کہا۔ "آج تو میں ان کا مہمان ہوں، کیوں کہ یہ مجھے اپنے گھر لے آئے ہیں۔ ان کی اجازت سے کل میں آپ کے ہاں آ جاؤں گا۔" شاہد لطیف نے بہت اصرار کیا مگر میں اُن کے ساتھ نہیں گیا۔ اُس رات دیر تک کرشن چندر اور مہندر ناتھ سے باتیں ہوتی رہیں۔ کرشن چندر فلموں میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ کہانیاں اور مکالمے

لکھے، پروڈیوسر بنے، ڈائرکٹر بھی بنے مگر درجۂ اوّل کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکے۔ کرتے بھی کیسے؟ اپنی مرضی تو چلتی نہیں تھی، جو سیٹھ پیسہ لگاتا تھا اس کے اشاروں پر چلنا پڑتا تھا۔ فلمی دُنیا میں کرشن چندر ریڈیو سے دس گنا زیادہ کماتے تھے مگر روپے پیسے کو انھوں نے ہاتھ کے میل سے زیادہ کبھی نہ سمجھا۔ اِدھر آیا، اُدھر اُڑایا۔ ایسے متوکّل بندے بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ فطرتاً وہ نشاطی تھے۔ "کھاؤ، پیو، موج کرو۔ کیوں کہ کل ہمیں مرنا ہے" پر اُن کا عمل تھا۔ مگر خلوصِ نیت کی برکت بھی کچھ ایسی تھی کہ کبھی انھیں تہی دست نہیں دیکھا اور نہ کبھی یہ سنا کہ وہ کسی کے قرض دار ہیں۔ سدا دس پانچ کو کھلا کر کھاتے تھے۔ مذہب اُن کے لیے نہ تو رُکاوٹ تھا اور نہ سفارش۔ نام کے ہندو تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب سے یکساں ملتے تھے۔

پھر وہ وقت آ گیا کہ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ جنگل کا قانون نافذ ہو گیا اور انسان درندہ بن گیا۔ ریلیں کٹنے لگیں اور تار اور ڈاک کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ اور ایک دن ایک ملٹری کا ٹرک ہمارے گھر پر آ گیا اور ہم بھرا پُرا گھر ایک پناہ گزیں رشتہ دار کو سونپ کر ٹرک میں سوار ہو گئے۔ شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اُس ٹرک نے ہمیں پرانے قلعہ میں اُتار دیا۔ یہاں اسّی ہزار آدمی پہلے سے موجود تھے۔ چپّہ بھر زمین صاف کر کے ہم بھی بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اندھی قسمت کے ہاتھوں ہم کھلونا بنے ہوئے تھے۔ پرانے قلعے میں تین دن محبوس رہنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک میں بھر کر نظام الدّین کے ریلوے اسٹیشن پر لے جایا گیا۔ اور ریل کے ڈبّے میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا گیا۔ صبح چھ بجے سے رات ایک بجے تک جو جہاں بیٹھا تھا وہاں سے ہل نہ سکا۔ رات کے ایک بجے ایک جھٹکے کے ساتھ ریل رُک گئی۔ اندر بھی اندھیرا تھا اور باہر بھی۔ پھر تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز آئی، اور ایک شور برپا ہوا کہ حملہ ہو گیا۔ ڈبّے کی ساری کھڑکیاں جھٹ بند ہو گئیں۔ گرمی اور حبس کے مارے دم نکلا جاتا تھا مگر باہر گولیاں برس رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ تک ہم نے اپنی موت کا انتظار کیا، مگر زندگی باقی تھی، بچ گئے۔ آدھی ریل حملہ آوروں نے بالکل صاف کر دی تھی۔ خدا خدا کر کے تیسرے دن لاہور پہنچے۔ مواصلات کے تمام سلسلے ٹوٹ چکے تھے۔ دلّی کے ایک اخبار نے ریل کے کٹنے اور میرے لاپتہ ہو جانے، میرے اور میرے پورے خاندان کے "شہید" ہو جانے کی خبر چھاپ دی۔ وہ اخبار

qasarulkutub.blogspot.com

کوئی اپنے ساتھ لاہور لے آیا اور اس کے حوالے سے اور اخباروں میں بھی یہ خبر چھپ گئی۔ ایک اخبار کا تراشا میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ وہ یہ ہے:

ایڈیٹر "ساقی" کا سانحۂ ارتحال

"آہ! شاہد احمد دہلوی!"

لاہور۔ ۴؍ نومبر۔ اخبارِ عصرِ جدید نے اطلاع دی ہے کہ یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ دہلی کے مشہور ماہنامہ "ساقی" کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی شہید کر دیے گئے۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔ آپ مع اہل و عیال دہلی سے پناہ گزین اسپیشل ٹرین میں لاہور جا رہے تھے کہ گاڑی پر حملہ ہوا۔ جس میں آپ بھی راہیِ عدم ہوئے۔ آپ کی موت سے اُردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے پس ماندگان سے دِلی ہمدردی ہے اور ہماری دُعا ہے کہ خدا انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنّت الفردوس میں جگہ دے۔

یہی خبر جب بمبئی پہنچی تو میرے احباب بہت رنجیدہ ہوئے اور کرشن چندر نے ایک تعزیتی جلسہ کیا جس میں وہ سب کچھ ہوا جو ایسے جلسوں میں ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے دوستی کا حق ادا کر دیا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں زندہ ہوں اور وہ خبر غلط تھی تو انھوں نے مجھے ایک بڑا محبت بھرا خط لکھا اور بمبئی میں ایک ایک سے کہتے پھرے کہ شاہد احمد زندہ ہیں، شاہد احمد زندہ ہیں۔

دوست تو بہت ملتے ہیں مگر مخلص دوست کم ہی ملتے ہیں۔ میری پوری ساٹھ سال کی زندگی میں مجھے دو تین سے زیادہ مخلص دوست نہیں ملے۔ ان میں سے ایک کرشن چندر ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ وہ بہت بڑے افسانہ نگار تو ہیں ہی، بہت بڑے انسان بھی تو ہیں۔ (۱۹۶۷ء)

حفیظؔ جالندھری

یادش بخیر حفیظؔ جالندھری صاحب ان چند نفوس میں سے ہیں جن کی قدر و وقعت میرے دل میں بہت زیادہ ہے۔ وہ تمام تر خود ساختہ پرداختہ "بڑے آدمی" ہیں۔ اُنھوں نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کی تعلیم حاصل کرتے۔ اسکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں تھے کہ انھیں غمِ روزگار نے مار لیا۔ طبیعت شروع ہی سے شاعرانہ پائی تھی۔ چھوٹا موٹا کاروبار کیا، راس نہ آیا۔ دُکان پر بیٹھے، نقصان اٹھایا۔ جسے ادب و شعر کا چسکا پڑ جائے، وہ اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ کہیں ہرن پر گھاس لادی جاتی ہے؟ جالندھر کی فضا میں چوکڑی بھول گئے۔ لاہور سدا سے ادب و شعر کی منڈی رہا ہے۔ خبر نہیں کسی کے مشورے پر یا ع

شوق در ہر دِل کہ باشد رہبرے در کار نیست

لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کا پہنچنا اور چوکڑیاں بھرنا۔ آناً فاناً کہیں سے کہیں پہنچے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، قدر دانوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ تو صاحب جالندھر کا مارا ایڈرا لاہور میں آ کر ابوالاثر حفیظؔ جالندھری بن گیا۔ سیزر کی طرح وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ورنہ اسی لاہور میں پچھلے سو سال میں ایک سے ایک جگادری شاعر آیا اور ٹہل مٹہلا کر چل دیا۔ کسی نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ

ترے مُنھ میں کے دانت ہیں ـــــ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خُدائے بخشندہ!

حفیظ صاحب کے عروج کا بھی وہ زمانہ تھا جب میں نے پہلے پہل انھیں دیکھا۔ میں اس زمانے میں ایف سی کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ ذکر ہے ۲۳-۱۹۲۴ء کا۔ ایف، سی کالج اس وقت وائی، ایم، سی، اے کے پہلو میں تھا۔ جہاں اب بڑی بڑی دکانیں اور دفتر بن گئے ہیں۔

یاد نہیں رہا، کیا تقریب تھی۔ کالج کے ہال میں کوئی سو لڑکا جمع تھا۔ کالج کا پورا اسٹاف مع پرنسپل لوکس کے ڈائس پر سجا ہوا تھا۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب تشریف لاتے ہیں۔ اس زمانے میں سابقوں میں "ابو" کی ردیف چل رہی تھی۔ ابوالکلام — ابوالکمال، ابوالمعانی، ابوالمکارم، ابوالخیر، ابوالمجاہد اور نہ جانے کیا کیا۔ "ابو" اعلان کے ساتھ ہی ایک نوجوان ڈائس پر آ گیا۔ سر پر اونچی باڑ کی ترکی ٹوپی، اچکن، چوڑی دار پاجامہ۔ وضع کسی طرف سے بھی جالندھری نہیں تھی۔ نہ سر پر کلاہِ زرّیں اور مشہدی، نہ بر میں لانبا کوٹ، نہ دھڑ میں شلوار۔ گیہواں رنگ، کھلی پیشانی، لمبوترا چہرہ، چمک دار آنکھیں، کتابی ناک، خشخشی مونچھیں، داڑھی صفاچٹ، بوٹا سا قد۔ نازک نازک ریشمین سے آدمی۔ بھلا ایسے ہوتے ہیں کہیں جالندھر والے؟

خیر تو ان صاحب نے پیچھے مڑ کر اجازت لی اور لہک کر آواز لگائی:

"کھاؤں کھاؤں!"

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ اُس زمانے میں مائکروفون نہیں تھے۔ بارے انھوں نے دوبارہ اپنا مصرع پڑھا تو معلوم ہوا کہ کہہ رہے ہیں ؏:

"ابھی تو میں جوان ہوں!"

اس کے بعد جو انھوں نے اپنے نئے انداز کی نظم سنانی شروع کی تو ہال میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی تھی، سب بند ہو گئیں اور ایسا سنّاٹا چھایا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ مگر ادھر نظم کا ایک بند ختم ہوا اور ادھر واہ وا! سبحان اللہ کا شور برپا ہوا۔ نظم خاصی طویل تھی اور حفیظ صاحب اس کے مصرعے ایسے چبا چبا کر پڑھ رہے تھے جیسے شاعری کی جگالی کر رہے ہوں۔ مگر ان کے ترنّم کی طرح ان کے پڑھنے کی یہ خاص ادا بھی بڑی دلبرانہ تھی۔ اس میں تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر کسی کو وقت کا احساس نہیں ہوا۔

جب نظم ختم کر کے وہ جانے لگے تو بے تحاشا تالیاں بجنے لگیں اور "ایک اور، ایک اور" کی دبی دبی سی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔

ڈاکٹر لوکس کا سارے کالج پر اس قدر رعب تھا کہ ان کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اونچی آواز میں بات کرے۔ حفیظ صاحب نے ٹھٹک کر اُن کی طرف دیکھا۔ انھوں نے مسکرا کر اپنے سر کو مثبت جنبش دی تو حفیظ صاحب نے واپس آ کر جونپوری دھن میں:

"بسا لے اپنے من میں پریت"

سنانا شروع کیا۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک نئے انداز کی شاعری تھی۔ کیوں کہ اُس وقت تک ہم نے شاعروں سے اور مشاعروں میں غزلیں ہی سنی تھیں۔ حفیظ نے اُس کے سنانے کے دوران میں نالوں سے ملتی جلتی آوازیں بھی نکالیں تو میرے کان کھڑے ہوئے۔

"ارے، یہ شاعر تو گوّیا بھی ہے!"

کلام کی جدّت و بے ساختگی اور ترنّم کی موزونیت، دل آویزی نے میرا دل موہ لیا۔ اور اسی وقت سے میں حفیظ صاحب کے خاموش قدردانوں میں شامل ہو گیا۔

سائنس کے طالب علم کو اتنی فرصت کہاں کہ شاعری اور شاعروں کے چکّر میں پڑے۔ مگر بدقسمتی سے ادب و شعر کی چیٹک مجھے بھی لگی ہوئی تھی۔ چور چوری سے جائے گا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی جائے گا۔ کالج کی لائبریری میں اردو کے اخبار رسالے بھی آتے تھے۔ اب میں ادبدا کر حفیظ صاحب کا کلام ان میں پڑھنے لگا۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی صنف دی تھی، اور یہ صنف تھی گیت کی۔ حفیظ کی نقالی میں ہندوستان کے ہر گوشے سے گیت لکھے جانے لگے۔ گیت کی ہیئت کے عجیب و غریب تجربے کیے جانے لگے۔ صورت یہ ہو گئی کہ "پیمانہ" یا کسی ایسے ہی رسالے کو اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو اکثر صفحوں پر SNAKES AND LADDERS (سانپ اور سیڑھیاں) بنی ہوئی دکھائی دیتیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ خیر سے یہ گیت ہیں، جن کی یہ ہیئت کذائی ہو گئی ہے۔ مگر حفیظ صاحب ہیں بڑے خوب صورت گیت اور بڑی حسین نظمیں دیتے رہے۔ انھوں نے گیت کے وقار کو قائم رکھا۔

qasrulkutub.blogspot.com

شمس العلماء میر ممتاز علی صاحب مرحوم تھے تو یُوپی کے رہنے والے، مگر پچاس ساٹھ سال پہلے انھوں نے لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ میر صاحب اور ان کی اہلیہ محمدی بیگم مرحومہ نے مل کر عورتوں کا ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" لاہور سے جاری کیا تھا۔ یہ ادبی اخبار غیر منقسم ہندوستان کے ہر شریف خاندان میں آتا تھا، اور اس قدر مقبول تھا کہ تہذیبی بہنوں اور تہذیبی بھائیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ بن گیا تھا۔ محمدی بیگم اچھے معاشرتی اور اخلاقی مضامین اس میں لکھا کرتی تھیں۔

جب امتیاز علی تاج نے ہوش سنبھالا تو محمدی بیگم نے بچوں کے لیے بھی ایک ہفتہ وار اخبار "پھول" جاری کیا۔ مرحومہ بچوں کے لیے روایتی اور اخلاقی کہانیاں بھی لکھتی تھیں جن میں سے بہت سی کتابی صورت میں چھاپ دی گئی تھیں۔

جب اخباروں اور کتابوں کا کاروبار بڑھا تو میر صاحب نے اخباروں کے لیے اڈیٹر ملازم رکھنے شروع کر دیئے۔ ان اڈیٹروں کو آسان اُردو لکھنے کی تربیت خود مولوی صاحب دیتے تھے۔ اس ادارے کے تربیت یافتہ اڈیٹروں میں بڑے بڑے نام دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً بیگم نذر سجّاد حیدر، سیّد وجاہت حسین جھنجھانوی، مولانا عبدالمجید سالکؔ، نشترؔ جالندھری، پنڈت ہری ناتھ اخترؔ، مولانا چراغ حسن حسرتؔ، مشہور افسانہ نگار غلام عباس اور آخر آخر میں حفیظؔ ہوشیارپوری، احمد ندیم قاسمی اور راجہ مہدی علی خاں۔ دورِ متوسط کے اڈیٹروں میں حفیظؔ جالندھری بھی شامل تھے۔

میر ممتاز علی صاحب سے میرے والد کے تعلقات مخلصانہ تھے، اور جب میں نے لاہور میں داخلہ لے لیا تو میں بھی کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ریلوے روڈ پر گھر اور دفتر ایک ہی جگہ تھا۔ یہیں میں نے امتیازؔ، پطرسؔ، سالکؔ، حفیظ جالندھری، غلام عباس، اور چراغ حسن حسرتؔ کو پہلی بار دیکھا۔ مگر یہ جلوہ دُور ہی کا تھا۔ حفیظ صاحب کی شہرت اس وقت پَر تول رہی تھی۔ عمرو عیّار وغیرہ دو ایک کتابیں بھی ان کی دارالاشاعت سے شائع ہو چکی تھیں۔ مگر ان کا نام شہرت کے پَر لگا کر اُس وقت اڑا جب انھوں نے "شاہنامۂ اسلام" لکھا۔ اور اس کے خاص خاص حصّے انھوں نے ایک مخصوص دُھن

میں سُنانے شروع کیے اور اُن کا سلام "سلام اے آمنہ کے لال" تو اتنا مقبول ہُوا کہ گھر گھر پڑھا جانے لگا۔ اس شاہنامہ نے انھیں "فردوسیِ اسلام" بنا دیا۔

لاہور کے شاعر اور ادیب ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور یہ ٹولیاں آپس میں ٹکراتی رہتی تھیں۔ ان کی ٹکّروں کی وجہ سے ادبی دُنیا میں خاصا ہنگامہ رہتا تھا۔ ایک بڑی ٹولی تو وہی تھی جس کے سرغنہ پطرسؔ تھے اور دارالاشاعت اس کا اڈّا تھا۔ انھیں حضرات نے آگے چل کر "نیاز مندانِ لاہور" کا رُوپ دھارا۔ دُوسری بڑی ٹولی شمس العلماء مولانا تاجورؔ نجیب آبادی کی تھی۔ تاجورؔ مرحوم ایک مقامی کالج میں پڑھاتے تھے، اس لیے ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ خود تاجورؔ بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ ان دونوں ٹولیوں میں آئے دن ٹکر ہوتی رہتی تھی۔ تاجورؔ کو نیچا دکھانے کے لیے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے بھی نکالے گئے، جن میں سے بعض کی ادارت حفیظؔ صاحب کرتے تھے۔ تاجورؔ ایک لحیم شحیم انسان تھے جنھیں دیکھنے کے بعد تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ گاماؔ پہلوان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ شاعر ہیں۔ مگر مولانا جس قدر گراں ڈیل تھے اسی قدر گراں ڈیل ان کا علم و فضل بھی تھا۔ وہ تنہا اپنی ذات سے اپنی حریف ٹولی پر بھاری تھے۔ حفیظؔ صاحب نے میدانِ کارزار گرم کر رکھا تھا۔ مگر تاجورؔ رولر کی طرح اس میدان پر پھر جاتے تھے۔ عجب لوہے کا بنا ہوا آدمی تھا، جو کبھی لڑتا تھا اور ڈٹ کر مقابلہ کرتا تھا۔ یہ لڑائیاں آج کل کی لڑائیوں کی طرح گھٹیا اور بے ہودہ نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی ایک وقار اور لطف ہوتا تھا۔ ادب و شعر کے آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتیں، دھواں دھار مینہ پڑتا۔ کوہ پیکر بادل ٹکراتے، شورِ قیامت برپا ہوتا، بجلی کے کڑاکے بنتے، کبھی کبھی جھڑی بھی لگ جاتی، مگر اکثر یہ ہوتا کہ برس کر کھُل جاتا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے طبیعتیں فرحت پانے لگتیں۔ جب تک مولانا لاہور میں رہے، اور آخر وقت تک وہ لاہور ہی میں رہے، یہ مقابلے اور مجادلے ہوتے رہے اور لاہور کی اَدبی رونق کو بڑھاتے رہے۔

حفیظؔ صاحب کی دیکھا دیکھی تقریباً سبھی شاعروں نے ترنّم سے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا تھا۔ شاعروں کی جان پر یہ اور غضب ٹوٹا۔ ایک سے ایک بے سُرا شاعر ہے کہ گا رہا ہے۔

اور میاں تان سین کی قبر پر لات مار رہا ہے۔ اس کا ردِ عمل ہونا ہی تھا۔ ایس پی ایس کے ہال میں اکثر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایک صاحب جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اور گاتے بجاتے بھی خوب تھے اور مولانا تاجور کی فوج میں شامل تھے ایک دفعہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ صاحب پوری طرح مسلّح تھے۔ اس مشاعرے میں حفیظ صاحب بھی آنے والے تھے، آ گئے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے وہ صاحب اسٹیج پر آئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ:

"آج کے مشاعرے میں جو صاحب گا کر اپنا کلام سنانا چاہیں وہ باقاعدہ گا کر سنائیں، سازوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے پردے کے پیچھے سے ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی نکال کر سامنے اسٹیج پر رکھ دی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک طبلہ نواز بھی آ کر بیٹھ گیا۔

مشاعرے میں ہڑبونگ مچ گئی۔

ان صاحب نے دوبارہ اعلان کیا کہ "سب سے پہلے میں آپ کو اپنا کلام گا کر سناتا ہوں۔"

چناں چہ انھوں نے باجہ سنبھالا اور پورے تال سُر سے اپنی غزل سنائی۔

جب انھوں نے گانا ختم کیا تو وہ تالیاں پٹیں اور وہ غوغا بلند ہوا کہ الامان الحفیظ۔ اور حفیظ حفیظ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مگر حفیظ صاحب چپکے سے اُٹھ کر پہلے ہی باہر نکل گئے تھے۔ بھلے آدمیوں کا ایسے مشاعروں میں کیا کام؟

حفیظ صاحب کی شہرت میں ان کی نظم "رقّاصہ" کو بھی بہت دخل ہے۔ ایک ریاست کے نوّاب نے ایک مشہور طوائف کے پیچھے ریاست کو برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک پنجابی گانا بھی بچے بچے کی زبان پر آ گیا تھا۔ "تو نبا وجدا نہیں تار بنا" وغیرہ۔ ایک جشن کے موقع پر حفیظ صاحب بھی اسی نوّاب کے دربار میں مدعو کیے گئے۔ حفیظ صاحب کی حق گوئی اور بے باکی نے ان سے نظم "رقّاصہ" کہلوائی اور بھرے دربار میں انھوں نے وہ نظم سنائی۔ حاضرین پر سنّاٹا چھا گیا۔ وہ رنڈی بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ حفیظ صاحب اُسی سے مخاطب ہو کر سناتے رہے۔ نظم میں چوں کہ اُسی کو مخاطب بھی

کیا تھا اس لیے کریلا اور نیم چڑھا! نظم بے حد تلخ ہو گئی۔

نوّاب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ پھر اس کے تیور بگڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد حفیظ صاحب پر انعام و اکرام کی کیسی کیسی بارشیں نہ ہوئی ہوں گی۔

یہ حفیظ صاحب کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ منھ پھٹ آدمی ہیں، صاف کہنا اور سُکھی رہنا۔ اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ راجہ رُوٹھے گا تو اپنی نگری لے گا۔ اور بے تکلّف دوستوں کو ایسی کھری کھری سُناتے ہیں کہ دھری جائیں نہ اُٹھائی جائیں۔ حال ہی میں پچاس ساٹھ اہلِ ادب کے ڈنر میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر نے حفیظ صاحب پر چند فقرے چست کیے۔ پھر جو حفیظ صاحب پنجے جھاڑ کر اس "شریف آدمی" کے پیچھے پڑے تو اُس کے لتّے لے ڈالے۔ وہ بار بار کھسیانی ہنسی ہنس کر اڑاتا رہا۔ مگر حفیظ صاحب نے لکھ پتی کی دو کوڑی کی کر دی۔

اتفاق سے میں اُن صاحب کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔ "دیکھا آپ نے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں دیکھا۔ آپ نے اس بھڑوں کے چھتّے کو کیوں چھیڑا؟"

روکھی مُسکراہٹ سے بولے: "بڑا پیارا آدمی ہے۔"

انگریزوں کا اصول تھا کہ مشہور آدمیوں کو خطاب دے کر اپنا آدمی بنا لیتے تھے۔ چناں چہ ہندوستان کے جتنے سربرآوردہ حضرات تھے۔ سب کو انگریز نے خطابات سے نواز دیا تھا۔ اس پالیسی کے تحت انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو "سر" کا خطاب دیا تھا اور مصوّر چغتائی کو "خان بہادر" کا۔ مگر حفیظ صاحب کو صرف "خان صاحب"۔ حفیظ صاحب اس کم نظری پر افسردہ اور برہم تھے۔ اور برہمی یوں اور بھی بڑھی کہ "خان صاحب" عموماً کلاونتوں اور ڈوم ڈھاڑیوں کو کہتے ہیں۔ نام کے ساتھ پڑھنے کی وجہ سے "خان صاحب" کا خطاب ان پر چپک کر رہ گیا۔ اور ان کے مخالفین اور بے تکلّف دوست انھیں یہ کہہ کر چھیڑنے لگے کہ "حکومت نے تمھاری صحیح قدر دانی کی ہے۔"

یہ خطاب حفیظ صاحب کے لیے سانپ کے منھ کی چھچھوندر بن گیا کہ نگلے تو اندھا،

qasarulkutub.blogspot.com

اور اُگلے تو کوٹھی مار رہے آگے چل کر جب انھیں "خان بہادر" کا خطاب ملا تو ان کی کسی قدر اشک شوئی ہوئی۔ مگر اب ان کی شہرت اور خدمات کی وہ نوبت آچکی تھی کہ انھیں "سر" کا خطاب ملنا چاہیے تھا۔ سر محمد اقبال کے اُٹھ جانے کے بعد حفیظ صاحب ہی کو "سر" کا خطاب ملنا چاہیے تھا مگر ان کو "خان بہادری" ہی پہ ٹرخا دیا اور ادھر مولانا تاجور کو شمس العلما بنا دیا! ع :

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

حفیظ صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، ہر رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ہر قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ شاعر ہیں، نثر نگار ہیں، اڈیٹر ہیں، مصنف ہیں، نغمہ کار ہیں، پرچارک ہیں، ملازمِ سرکار ہیں۔ بلکہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا نہیں ہیں۔ بڑی پہلودار شخصیت ہے حفیظ صاحب کی۔ جب پچھلی بڑی لڑائی نے زور پکڑا تو حکومت نے سانگ پبلسٹی کا محکمہ کھولا۔ اس محکمہ کا کام یہ تھا کہ گانوں اور ڈراموں وغیرہ کے ذریعے بھرتی ہونے کی ترغیب دلائی جائے، اور حکومت کا بول بالا کیا جائے۔ اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ حفیظ صاحب مقرر ہوئے۔ حفیظ صاحب نے اس محکمے کے فرائض افسرانِ بالا کے اطمینان کے مطابق انجام دیے۔ حفیظ صاحب گیت لکھتے تھے اور سازندوں میں بیٹھ کر خود ہی گیتوں کی دُھنیں تجویز کرتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ "بھیّا! تم لوگ راگ راگنیوں اور تالوں کو دیکھتے ہو، ہمارا کام دوسری قسم کا ہے۔ میرا معیار گانے کا جاننے ہو گیا ہے؟ وہ جو کشمیری دروازے کے بس اسٹینڈ پر ایک اندھا فقیر کھڑا صدا لگاتا رہتا ہے نا؟ بس مجھے تو ایسی دُھنیں چاہئیں"

اور میں مُنھ پھیر کر اپنے ساتھی سے کہتا۔ "ہاں، اندھوں کے لیے تو اندھوں ہی کی دُھنیں چاہئیں۔"

حفیظ صاحب چونک کر کہتے۔ "کیا کہہ رہے ہو پیارے"

میں کہتا۔ "کچھ نہیں، اِن سے بات کر رہا تھا"

پھر فرماتے۔ "اب یہ وہ حفیظ نہیں ہے جیسے تم رسالوں اور کتابوں میں دیکھتے آئے

ہو۔ میں اب ایسے گیت لکھتا ہوں: میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے۔"

"بہت اچھا حفیظ صاحب این ہم اندر عاشقی .... شاید آپ ہی کے محکمے کا ایک گیت مجھے کسی نے سُنایا تھا۔ اچھا ہے ہریانہ کی بولی ہیں :

بھرتی ہو جا رے ترسے باہر کھڑے رنگروٹ

یہاں تو پہنے پھٹا پُرانا وہاں ملے گا سُوٹ

بھرتی ہو جا رے ....

یہاں تو پہنے نری کا جُوتا وہاں ملے کا بُوٹ

بھرتی ہو جا رے ....

یہاں تو لیوے لاٹھی ڈنڈا وہاں ملے بندُوک

بھرتی ہو جا رے ....

بولے۔ "نہیں نہیں، یہ گیت میرا نہیں ہے۔ کسی اور کا ہے۔"

حفیظ صاحب اس محکمے کے اس وقت تک ڈائرکٹر رہے جب تک یہ محکمہ قائم رہا۔ حفیظ صاحب بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں اور آخر تک نباہے چلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اُن کی خدمات کے پیشِ نظر حکومت نے پانچ سو روپے پنشن مقرر کر دی تھی، مگر کہیں اُوسوں سے پیاس بجھتی ہے؟ یہ رقم اُونٹ کی ڈاڑھ میں زیرا ہو گئی۔ مگر سونا ایک بار پھر اس وقت معیار پر کسا گیا، جب پاکستان میں دیہی امداد کا محکمہ قائم ہوا۔ حفیظ صاحب کو اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ معقول مشاہرہ ملنے لگا۔ مگر سیکرٹریوں کو تو چار چار ہزار ملیں اور حفیظ صاحب کو صرف دو ہزار کی بافت ہو: ع

اے کمالِ افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

تو صاحب، چند سال کی الٹا پلٹی میں یہ محکمہ بھی ختم ہو گیا۔ مگر ست کر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔ مارشل لا کا زمانہ آگیا اور حفیظ صاحب محکمۂ تعمیرِ نو میں مشیر مقرر ہو گئے۔ اب سُنا ہے کہ وہ محکمہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ عارضی محکموں کی یہی تو خرابی ہے کہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ع

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

qasarulkutub.blogspot.com

اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو ستر کھلتے ہیں اور بحمد اللہ، حفیظ صاحب تو بڑے نصیبہ ور آدمی ہیں۔ جیسے سانپ کو زمین جگہ دیتی ہے ویسے حفیظ صاحب کو حکومت جگہ دیتی ہے۔ یہ تو درزی کی سوئی ہے کہ ریشم اور مخمل میں بھی چلتی ہے اور گاڑھے گزی میں بھی۔

حفیظ صاحب میں، شعر و موسیقی میں جو ربط ہے، اس کا سب شاعروں سے بڑھ کر شعور ہے۔ اس کی ایک بین مثال "ترانۂ پاکستان" ہے۔ میں اس وقت ریڈیو پاکستان میں نگرانِ موسیقی تھا، جب ترانۂ پاکستان کا غلغلہ اُٹھا۔ اس ترانے کی دھن کے پانچ ہزار اور اس کے الفاظ کے پانچ ہزار مقرر کیے گئے تھے۔ صبح سے شام تک دھن بنانے والے اپنے سروں کو دھنتے اور اپنی اپنی دھنیں ریکارڈ کرا کر چلے جاتے۔ کراچی کے علاوہ اور شہروں سے بھی دھنوں کے ریکارڈ اس مقابلے میں شریک کیے گئے تھے۔ اور میعاد پوری ہو جانے پر اس وقت کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں مرحوم کو منتخب دھنیں سنائی گئی تھیں چھاگلا مرحوم کی دھن سب سے بہتر سمجھی گئی تھی مگر اسے بھی لیاقت علی خاں مرحوم نے پوری طرح پسند نہیں کیا تھا۔ ان کے بعد جو وزیر اعظم صاحب تشریف لائے تھے، انھوں نے مزید انتظار کیے بغیر چھاگلا کی دھن منظور کر لی۔

اس کے بعد شاعروں کو اذنِ عام دیا گیا کہ دھن پر ترانۂ پاکستان کے بول بٹھاؤ۔ اب پھر شاعروں کی تاخت ریڈیو اسٹیشن پر ہونے لگی۔ بڑے بڑوں نے زور مارا۔ ان سب کے ریکارڈ بھی بھرے گئے۔ حفیظ صاحب نے بھی اپنا ترانہ ریکارڈ کرایا۔ پھر ان سب بولوں کی جانچ خدا جانے کن بڑے بڑے ماہروں نے کی اور سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ حفیظ صاحب کا ترانہ سب سے بہتر ہے۔ میں نے بھی ریکارڈنگ کے دوران میں بعض نامی شاعروں کے بول دیکھے اور سنے تھے۔ واقع میں حفیظ کے ترانے سے بہتر تو کجا، کوئی اس کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔

یار لوگوں نے پہلے ہی سے شور مچا رکھا تھا کہ یہ کیسی اُلٹی کارروائی ہو رہی ہے۔ پہلے چیز لکھی جاتی ہے، اس کے بعد اس کی دھن بنائی جاتی ہے۔ یہاں پہلے دھن بنا دی گئی ہے

اور بعد میں اس پر بول کہلوائے جا رہے ہیں۔ بہتوں کو انگریزی میں غصہ آیا اور انھوں نے انگریزی محاورہ PUTTING THE CART BEFORE THE HORSE دُہرایا۔ مگر جیسے پیا چاہے وہ سہاگن۔ حفیظ صاحب سہاگن بنے اور پانچ ہزار رُونمائی میں انھیں ملے۔ مگر روپیہ پیسہ کیا ہے؟ یہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ پھر حفیظ جیسے صاحبِ ثروت کے نزدیک پانچ ہزار کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ یہ کتنے بڑے اعزاز اور سرفرازی کی بات ہے کہ کسی شاعر کا لکھا ہوا ترانہ پوری قوم اور ملک کا ترانہ بن جائے۔ یہ افتخار حفیظ صاحب کو حاصل ہوا، اور وہی اس کے مستحق بھی تھے۔

اس کامیابی کا اعلان ہونا تھا کہ یار لوگ کوئلوں پہ لوٹ گئے۔ اور تو اور، حفیظ صاحب کے قریب ترین دوست، قدر دان، مدّاح، سالک اور مجید لاہوری جیسے بھی ہتھے سے اُکھڑ گئے۔ اور نہ صرف اس ترانے کی مخالفت ان دوستوں نے کی، بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا۔ اور اس کی پیروڈی بھی لکھی۔ بلکہ ان کے ایک دوست نے جس سے چانٹا چپول کا مذاق ہوتا ہے، اسی بحر اور اسی دھن میں ایک فحش پیروڈی لکھی، جسے وہ مزے لے لے کر حفیظ صاحب کی موجودگی میں دوستوں کو سنایا کرتے تھے اور حفیظ صاحب کلستے رہ جاتے تھے۔ دوستوں کا یہ وتیرہ ذرا کم دیکھنے میں آتا ہے۔

حفیظ صاحب کو میں نے بیسیوں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں پڑھتے سنا ہے۔ بڑے اعتماد سے پڑھتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہے۔ چالیس چالیس سال پہلے کی کہی ہوئی طویل طویل چیزیں انھیں اب بھی ازبر ہیں۔ جب وہ کسی مشاعرے میں اپنا نیا کلام سناتے ہیں تو ان سے "رقاصہ" یا "بسا لے اپنے من میں پیت" یا "جاگ سوزِ عشق جاگ" سنانے کی ضرور فرمائش کی جاتی ہے۔ اب وہ سنانے سے پہلے ایک چھوٹی سی تقریر بھی ضرور کرتے ہیں۔ اور جب زیادہ لاڈ میں آتے ہیں تو گنگنا کر پڑھنے لگتے ہیں اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک ادائے محبوبی ہے۔ اور جب انھیں کسی شعر کی بہت داد ملتی ہے تو وہ اس قدر بلک بلک کر اس شعر کو دُہراتے اور تہراتے ہیں کہ مشاعرے کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ان کا غمزۂ ترکانہ ہے۔ ان کے قدر دان

qasarulkutub.blogspot.com

ان کی اُلٹی اداؤں پہ لوٹ ہیں۔

حفیظ صاحب شہرت کے اس درجے پر اب پہنچ گئے ہیں کہ جب ان سے پہلی بار کسی کا تعارف کرایا جاتا ہے تو صرف بسور کر کھیسیں نکال دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ نئے آدمیوں سے بات کرنے میں اس قدر احتیاط برتتے ہیں کہ خاموش رہنے ہی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سے کئی دفعہ تعارف ہو چکا ہے مگر پھر جب ملتے ہیں تو انجان بن جاتے ہیں۔ شاید تجاہلِ عارفانہ بھی بڑے آدمیوں کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ شاید نہ پہچاننے سے بزرگی و عظمت قائم ہوتی ہو؟ یہ حادثہ بارہا مجھے پیش آ چکا ہے کہ میں نے مؤدبانہ سلام کیا اور انھوں نے نہایت بے مروّتی سے سر کو خفیف سی جنبش دے دی، یا ہاتھ سے مکھّی سی اڑا دی۔ جب پھر کچھ دیر بعد کسی نے تعارف کرایا تو پہلے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا، پھر چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کیا، پھر وفورِ مسرّت کا۔ اور پھر "ارے تم ہو شاہد!" کہہ کر گلے لگا لیا۔ اگلی دفعہ پھر اجنبی کے اجنبی دھرے ہوئے ہیں۔

اصل میں اس بناوٹ کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ انھیں ہزاروں آدمیوں سے ملنا ہوتا ہے، کہاں تک اور کس کس کو یاد رکھیں؟ لہٰذا اب میں انھیں یاد رکھتا ہوں اور جب کبھی اور جہاں کہیں بھی ان سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو میں خود ہی "ہاؤ" کر کے ان سے لپٹ جاتا ہوں۔ میں ان سے کئی سال چھوٹا ہوں، مگر وہ میری اس گستاخی کو گوارا فرما لیتے ہیں۔

حفیظ صاحب کو ان کے اسی تجاہلِ عارفانہ اور خاموشی کی وجہ سے لوگ مغرور اور اوچھا آدمی سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل کھرے سونے کا ہے۔ مگر اس دل کی گھنڈی وہ بڑی دیر میں کھولتے ہیں۔ اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو پھر ان کے بے پایاں خلوص کو دیکھیے، ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔

۱۹۵۰ء میں بے کاری و بے روزگاری کی وجہ سے جب میرا سارا اندوختہ ختم ہو گیا، اور میں مقروض ہونا شروع ہو گیا تو چند بھلے آدمیوں نے مجھ سے کہا کہ میاں یوں کب تک گزر کرو گے؟ ہم نے تمھارے لیے بات کی ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ تم سے واقف ہیں۔ تم ذرا ان سے مل تو لو۔ چناں چہ شیخ صاحب سے ملنے دو ایک دن کے

بعد ان کے دفتر پہنچا۔ اطلاع کرائی، رسائی ہوئی، خوش اخلاقی سے ملے۔ کم گو آدمی ہیں مگر معاملہ فہم اور مردم شناس۔ بولے۔ "آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے، مگر ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ یا تو "ماہِ نو" کی اڈیٹری قبول فرمایئے یا ریڈیو پاکستان میں آجایئے۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنا پرچہ "ساقی" نکالتا ہوں اس لیے "ماہِ نو" کا اڈیٹر نہیں بن سکتا۔"

بولے۔ "تو ریڈیو پاکستان میں آجایئے اور ہمارے سیکرٹری جی، احمد صاحب سے بھی ملتے جایئے۔"

میں نے کہا۔ "کیا آپ سے مل لینا کافی نہیں ہے؟"

بولے۔ "رسماً مل لیجیے۔"

جی، احمد صاحب سے بھی ملا۔ انھوں نے فرمایا۔ "اکرام صاحب نے ابھی ابھی بتایا کہ آپ ریڈیو پاکستان میں آرہے ہیں۔ بہت خوشی کی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں، وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔"

فرمایا۔ "اسے آپ نوکری ہرگز نہ سمجھیں۔"

ان کے کمرے سے باہر نکلا تو سامنے برآمدے میں اے۔ ڈی۔ اظہر اور حفیظ صاحب کھڑے نظر آئے۔ دونوں سے مصافحہ ہوا۔

حفیظ صاحب نے پوچھا۔ "خیر تو ہے، آپ یہاں کہاں؟"

میں نے کہا۔ "نوکری لینے آیا تھا۔"

پھر مختصر روداد انھیں بتائی تو بے حد اداس اور متاسف ہو کر اظہر صاحب سے بولے "سنتے ہو اظہر، پاکستان میں شاہد نوکری کر رہا ہے!"

پھر اظہر صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ اس وقت پاکستان ریلوے کے فنانشل ایڈوائزر تھے۔ دیر تک افسوس کرتے رہے اور مجھے سمجھاتے رہے۔ حفیظ صاحب کو اس دن میں نے دیکھا کہ واقعی انھیں اس اطلاع سے صدمہ ہوا۔ یہ اگر ان کا خلوص نہیں تھا تو پھر کیا تھا۔

حفیظ صاحب نے ویسے تو دنیا بہت دیکھی اور زمانے کا گرم و سرد بھی چکھا ہے مگر

qasarulkutub.blogspot.com

ان میں چھل فریب اور عیّاری نہیں ہے۔ کبھی کبھی بڑی بھولی بھولی باتیں کرتے ہیں تو ان پر بڑا پیار آتا ہے۔

ایک دفعہ کہنے لگے "میں سرکاری ملازمتوں اور اس کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بس پھر میں یہ کروں گا کہ مسجدوں اور دیہاتوں میں جایا کروں گا اور مجمع سے کہوں گا، لاؤ، تم سب دو دو پیسے نکالو، میں تمھیں "شاہنامۂ اسلام" سناؤں گا۔ میرے پاس اتنے پیسے آ ہی جائیں گے کہ دو وقت کی روٹی مجھے مل جائے گی۔ باقی وقت میں کتابیں لکھوں گا۔ قوم کا بھی بھلا ہوگا اور اپنا بھی۔"

حفیظ صاحب کے بھولپن کا ایک اور واقعہ یاد آیا:

دو ڈھائی سال ہوئے کہ ایک خیر سگالی وفد دلّی گیا تھا۔ اس میں حفیظ صاحب بھی تھے۔ امرت سر پر حکومتِ ہند کا ایک نمائندہ ہماری پذیرائی کے لیے موجود تھا۔ اسٹیشن کے رستوران میں سب کو کھانا کھلایا گیا۔ اتنے میں ریل کے آنے کا وقت ہو گیا۔ سب کی سیٹیں فرسٹ کلاس میں بُک تھیں۔ ہر ڈبّے میں چار سیٹیں تھیں۔ ہم چار چار کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ذوالفقار بخاری، شوکت تھانوی، سیّد محمد جعفری اور میں ایک ڈبّے میں داخل ہو گئے۔ قُلّی نے بستر کھول کر لگا دیے۔

جب ہم اپنی اپنی سیٹوں کے ہو گئے تو بخاری صاحب نے کہا۔ "ارے یار، حفیظ کو لاؤ۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔"

شوکت تھانوی ان کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ جب گاڑی چھوٹنے لگی تو وہ ڈگ بھرتے ہوئے آئے اور بولے۔ "حفیظ تو ایر کنڈیشنڈ کوچ میں سو رہے ہیں۔ میں نے سارے فرسٹ کلاس دو دفعہ چھان ڈالے۔ کہیں دکھائی نہیں دیے۔ پھر کنڈکٹر گارڈ سے میں نے کہا کہ صاحب، ایک صاحب، جن کا نام ابو الاثر حفیظ جالندھری ہے، ہمارے ساتھ وفد میں آئے تھے، وہ کھو گئے ہیں، کیا آپ ان کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟"

اُس نے لسٹ نکال کر دیکھی اور بولا۔ "وہ دیکھیے ایر کنڈیشنڈ کوچ ہے۔ اس کے فلاں خانے میں آپ کے دوست ہیں۔"

میں نے وہاں جا کر دیکھا تو حفیظ صاحب آرام سے پڑے سو رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "حضرت ابھی سے سونے کا کیا موقع ہے؟"

تو بولے۔ "یار لڑ لڑا کر تو یہ جگہ لی ہے۔ اب تم چاہتے ہو کہ یہ مجھ سے چھن جائے؟ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے اس میں جگہ نہ دی گئی تو میں واپس چلا جاؤں گا، اور تم، تم تو.... ہو جیسے تم فرسٹ کلاس سمجھ رہے ہو وہ دراصل سیکنڈ کلاس ہے۔ جاؤ بیٹا اسی میں مرو۔ بندہ تو اب سوتا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے کروٹ لے لی۔

بخاری صاحب نے اس اطلاع پر ہنس کر کہا۔ "میاں تم تو کہتے تھے کہ حفیظ بھولا آدمی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھولا آدمی ہی ایسی بات کر سکتا ہے۔"

جب وفد کا کام ختم ہو گیا تو سب سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہہ دیا کہ کل صبح ہم سب کو ہوٹل چھوڑ دینا ہے۔ جو صاحب دلّی میں ابھی اور ٹھہرنا چاہیں، اپنا انتظام خود کریں۔ میں تو اُسی شام ہوٹل سے اٹھ کر شہر میں اپنے ایک عزیز کے ہاں آ گیا۔ پانچ چھ دن اور دلّی میں ٹھہرا۔ واپسی ٹکٹ سب کے پاس تھے۔ جس رات کو واپسی تھی میں اسٹیشن پہنچا تو فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس پر بہت بھیڑ تھی۔ ان میں جگن ناتھ آزاد اور کئی شاعر کھڑے دکھائی دیے۔ ان سے تجدیدِ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سب کے سب لائل پور جا رہے ہیں ایک مشاعرے میں۔ میں ان حضرات سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایک سردار جی گھبرائے ہوئے آئے اور بولے۔ "آپ حفیظ جالندھری ہیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں، میرا نام تو شاہد احمد دہلوی ہے۔"

آزاد صاحب نے انھیں بتایا کہ "حفیظ صاحب تو صبح کی گاڑی سے لائل پور چلے گئے۔"

میں نے کہا۔ "فرمائیے آپ کو حفیظ صاحب سے کیا کام ہے؟"

سردار جی بولے۔ "جی میں یہاں کا بکنگ کلرک ہوں۔ حفیظ صاحب نے اپنا دلّی سے لاہور کا واپسی ٹکٹ واپس کر دیا تھا اور میں نے اس کا پیمنٹ کر دیا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کچھ اس قسم کا سرکاری ٹکٹ تھا جو واپس نہیں کیا جا سکتا۔ اور جی میں تو غریب

qasralkutub.blogspot.com

آدمی ہوں، مجھے اپنی جیب سے یہ پیسہ بھرنا پڑے گا۔"

میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ "آپ گھبرائیے نہیں، آپ کا پیسہ آپ کو واپس مل جائے گا۔"

سب شاعر کھڑے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ میں نے آزاد صاحب سے کہا۔ کہ "آپ لایل پور پہنچ کر حفیظ صاحب سے ٹکٹ کے پیسے واپس لے لیں اور ان سردار جی کو واپسی پر دے دیں۔" بچارا سردار شکریہ ادا کر کے ریل کے چھوٹنے تک وہیں کھڑا رہا۔

ہُوا یہ تھا کہ حفیظ صاحب کے پاس دو ٹکٹ پاکستان جانے کے ہو گئے تھے۔ ایک وفد کی واپسی تھی اور دوسرا مشاعرے کا ٹکٹ۔ لہٰذا انھوں نے واپسی ٹکٹ واپس کر دیا۔ اور کسی نے واپس کرنے پر رَدّ وکد بھی نہیں کی۔ لہٰذا انھوں نے پیسے جیب میں ڈالے اور پاکستان چل دیے۔ مگر یار لوگ بعد میں کہتے رہے کہ حفیظ صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے ہمیں ہندوستانیوں کی نظر میں ذلیل کرایا۔ میں کہتا ہوں کہ "حفیظ صاحب آخر دو ٹکٹوں کا کیا کرتے؟" وہ کہتے ہیں کہ "دُوسرا ٹکٹ لیا ہی کیوں؟" یہ عجیب منطق ہے۔ پیسہ آتا ہُوا کِس کو بُرا لگتا ہے؟

حفیظ صاحب اُردو کے شیدائی اور شعر و ادب کے فدائی ہیں۔ یُوپی والوں نے ایک زمانے میں ان کے کلام پر بھی بڑی لے دے کی تھی۔ اہلِ زبان کو اگرچہ اس کا حق حاصل ہے کہ غیر اہلِ زبان کی غلطیوں سے انھیں آگاہ کریں، مگر اس کا بھی ایک شائستہ پیرایہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ والوں نے ایک باقاعدہ محاذ بنا رکھا تھا اور اسے بڑی فوقیت سمجھتے تھے کہ دُوسرے شہر والوں کی زبان پکڑتے رہیں۔ یہ ان کی پُرانی خصلت ہے۔ اِسی وجہ سے دِلّی اور لکھنؤ کے دو دبستان بنے اور اُن میں بڑے بڑے معرکے ہوتے رہے۔ حفیظ تو حفیظ اُنھوں نے اقبالؔ تک کو نہیں بخشا۔ مرحوم نے ایک آدھ بار تو جواب دیا اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ مگر حفیظ صاحب لڑنے اور اَڑنے سے نہیں گھبراتے۔ یہاں تک کہ ادب کے ٹھٹھ بندوں نے ان کا لوہا مان لیا۔ چناں چہ ان کا ایک شعر ہے:

حفیظؔ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

لکھنؤ والوں کے مُنھ کو تُوتُو لگ گیا تھا۔ جب کوئی اور ہاتھ نہ آتا تو آپس میں ہی لڑتے مرتے تھے۔ آخری معرکہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہُوا، اثرؔ اور فراقؔ کا ہو چکا ہے جس میں نوبت کھُلی کھُلی گالیوں تک پہنچی۔ اب آخر آخر میں ان کا کچھ دَف مرا ہے۔ جب بھارت کی حکومت نے خود ان کے صُوبے میں اُردو کو کوئی حیثیت نہیں دی اور ان کا بیس لاکھ دستخطوں کا محضر بھی ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔

حفیظ صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہیں کہ ان کی خانگی زندگی ہمیشہ خوش گوار گزُری۔ بعض سطحی نظر رکھنے والے حضرات معترض ہوتے ہیں کہ انھوں نے ایک چھوڑ تین تین شادیاں کیوں کیں؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ حسبِ ضرورت کیں۔

جب وہ سر عبدالقادر کے ساتھ ولایت گئے تو وہاں سے ایک میم کر لائے۔ وہاں تو عورت ایک چھولگتی بیماری ہے۔ حفیظ صاحب شریف آدمی ہیں۔ وہاں کوئی گلے پڑ گئی تو اسے اپنے ساتھ لانا ہی پڑا۔ ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ یار لوگ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر بیویاں یا داشتائیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ "قصّہ زمیں برسرِ زمیں"۔ مگر شریف آدمی کی بڑی مشکل ہے کہ اپنی شرافت میں مارا جاتا ہے۔ حفیظ صاحب اپنی میم صاحب کو ساتھ لے آئے۔ کئی سال تک وہ ان کے ساتھ رہیں۔ اُن سے بچے بھی ہوئے۔ مگر اس قوم میں وفاداری کہاں؟ بڑی بے مروّتی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنے بچوں کو لے کر میم صاحب اپنے وطن ہمیشہ کے لیے سدھار گئیں۔ کسی قسم کی انتقامی کارروائی کرنے میں شرافت مانع تھی اور حفیظ صاحب اپنا دِل مسوس کر رہ گئے۔

اللہ نے انھیں اس صبر کا اجر یُوں دیا کہ انھیں دِلّی کے ایک شریف گھرانے کی خاتون اس سانحہ کی تلافی کرنے کے لیے مل گئیں اور حفیظ صاحب نے چپُ چپاتے اُن سے شادی کر لی۔ ان کے اکثر احباب کو بھی اس کا علم نہیں ہُوا۔ ضرورت بھی کیا تھی اس کی تشہیر کرنے کی؟ ہا مجھ پر بھی یہ بات یُوں کھل گئی کہ چند سال پہلے میں جب ریڈیو پاکستان لاہور، پروگرام نشر کرنے گیا تو ڈیوٹی رُوم میں ایک جانی پہچانی خاتون کو بھی بیٹھے دیکھا۔ انھوں نے بھی مجھے پہچان کر سلام کیا۔

qesarulkutub.blogspot.com

ڈیوٹی آفیسر نے حیران ہو کر باری باری سے ہم دونوں کو دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔

"آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟"

مَیں نے کہا "یہ آل انڈیا ریڈیو، دِلّی کے ڈراموں میں شریک ہُوا کرتی تھیں اور قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے اسٹیشن کے ڈراموں میں حصّہ لیتی رہی ہیں۔"

"جی ہاں، مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی کراچی میں بھی ہم لاہور کے ڈرامے سُن لیتے ہیں۔"

"بس آپ کو اتنا ہی معلوم ہے؟"

"اس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی مجھے کیا ہے؟"

"اجی صاحب، یہ مِسز حفیظ ہیں۔"

"ایں؟ اچھا تو آپ ہیں مِسز حفیظ! مِسز حفیظ السّلام علیکم!"

پھر ہم سب ہنس پڑے، اور چائے آگئی۔ اور مِسز حفیظ نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔ حفیظ صاحب واقعی خوش نصیب ہیں کہ انھیں اتنی اچھی بیوی مل گئی۔ اللّٰہ تعالیٰ جو کام کرتا ہے، بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ اگر بیگم صاحبہ رُوٹھ کر نہ چلی جاتیں تو یہ نیک بی بی حفیظ صاحب کو کہاں سے ملتی؟ ؎

"خدا شرّے برانگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد"

حفیظ صاحب علم و ادب یا ادیبوں کا کوئی کام ہو، اس میں بے چُون و چرا شریک ہو جاتے ہیں۔ عجیب لوچ دار طبیعت پائی ہے انھوں نے۔ بُڈھوں میں بُڈھے، جوانوں میں جوان اور بچّوں میں بچّہ بن جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو نے بھی انھیں ہر دِل عزیز بنا رکھا ہے۔

جب ہم نے گِلڈ کا پہلا جلسہ کیا تو کئی سو بلاوے پاکستان کے دونوں حِصّوں میں ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے تھے۔ مجھے کنوینر بنایا گیا تھا۔ خدا کے فضل سے سبھی اس جلسے میں شریک ہو گئے تھے۔ اور جب اس کے ضوابط مرتّب کیے گئے تو ان پر خاصہ ہنگامہ ہُوا تھا۔ حفیظ صاحب ایک ایک کو ٹھنڈا کرتے پھرتے تھے۔ کسی کو پیار سے راضی کرتے اور

کسی کو خوشامد درآمد سے اور کسی کو آنکھیں دکھا کر۔ اس سے زیادہ ہنگامہ اُس وقت ہُوا، جب الیکشن ہُوا۔ طے یہ ہُوا کہ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ اور مرکزی گِلڈ کا الیکشن فی الحال کر لیا جائے۔ لاہور اور ڈھاکہ کے الیکشن میں کچھ پیچیدگیاں پڑیں مگر کراچی والوں نے یہ عجیب فیصلہ کیا کہ مجھے نامزد کر دیا کہ کراچی کے لیے ممبر میں نامزد کر دُوں۔ ؏

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

یہ ہفت خواں بھی بغیر کسی اختلاف کے بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ حفیظ صاحب کا نام کسی فہرست میں شامل نہیں ہُوا، مگر ان کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی۔ انھوں نے نہ تو اس وقت نہ تو کسی سے شکایت کی اور نہ بعد میں انھیں گِلڈ میں کوئی عہدہ دیا گیا۔ بلکہ اب تک کے ہر معاملے میں ہم ان کے بزرگانہ مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور خود حفیظ صاحب اپنے آپ کو گِلڈ کا ایک مستعد سپاہی سمجھتے ہیں۔ جب بھی ہمیں ان کی ضرورت ہوتی ہے ہم انھیں بے تکلّفی سے بُلا لیتے ہیں اور وہ اپنے دس کام چھوڑ کر آجاتے ہیں۔ یہ کتنے بڑے ظرف کی بات ہے کہ بغیر کسی ذاتی مفاد کے حفیظ صاحب گِلڈ کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک بہت بڑے شاعر اس بات پر مچلے ہوئے ہیں کہ مجھے گِلڈ میں کوئی عہدہ دیا جاتا تو مَیں ممبر بن جاتا۔ اس کے برعکس حفیظ جیسی عظیم شخصیت کا شاعر ہانکے پکارے کہتا رہتا ہے کہ مجھے گِلڈ میں ہرگز کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔ مَیں گِلڈ کا ایک خادم ہوں اور خادم ہی رہنا چاہتا ہوں ؏

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بکجا

دو ڈھائی مہینے ہوئے کراچی کے گِلڈ نے "یومِ نذیر احمد" منایا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے گِلڈ کے تمام ممبروں اور غیر ممبروں کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا گیا تھا۔ حفیظ صاحب اتفاق سے کراچی میں موجود تھے۔ ان کی بھلمنساہت دیکھیے کہ وہ نہ صرف اس تقریب میں شریک ہوئے بلکہ انھوں نے نذیر احمد کے ادب اور معاشرے پر اس کے اثرات پر ایک جامع تقریر کی تھی اور اس موقع کے لیے نذیر احمد پر ایک یادگار نظم بھی لکھی۔ وہ نظم آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اے نذیر احمد صریرِ ہر قلم ہے تیری یاد
لوحِ دل پہ جب سے تُو نے لکھ دیا حق العباد

تیری تحریروں سے پہلے کیا تھی حالت قوم کی
چھائی تھی بن کر مرض پہ تیرہ جہالت قوم کی

qasrulkutub.blogspot.com

نبض تو نے دیکھ لی بگڑا ہوا تھا ہر مزاج — اے مسیحائے قلم! تو نے کیا اس کا علاج
دور رس تھی عقل تیری اور روشن تھا دماغ — ملک میں روشن کیا تہذیب کا تو نے چراغ
تیری ہر تحریر ہے تصویرِ خورشیدِ علوم — کرتے ہیں کسبِ ضیا اس نور سے ماہ و نجوم
نور تیرے ہی قلم نے ملک میں پھیلا دیا — رات کو دن کر دیا کرنوں کا مینہ برسا دیا

دشمنِ اسلام کا منھ تو نے کالا کر دیا
علم و فن کا تو نے عالم میں اُجالا کر دیا

حفیظ صاحب جب ہماری دل جوئی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں تو ہم بھلا انھیں اپنے دل میں جگہ کیوں نہ دیں؟ یہ حفیظ صاحب کی نیک نیتی اور نیک نفسی ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر قسم کا سکون دے رکھا ہے۔ شہرت، عزت، دولت، سبھی سے اللہ نے انھیں نوازا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی ایک چھوڑ دو کوٹھیاں ہیں۔ چلن کے آدمی ہیں۔ کوئی عیب ان کے پیچھے نہیں لگا ہے۔ اپنے آپ کو انھوں نے بڑی محنت سے بنایا ہے۔ اس لیے انھیں روپے پیسے کی بھی قدر ہے۔ جزرس ہیں۔ بلکہ ان کی جزرسی کنجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ کنجوس کہلانا مسرف کہلانے سے بہر حال بہتر ہے۔ انھوں نے اپنی کار کبھی نہیں خریدی، حالاں کہ وہ اگر چاہیں تو ایک نہیں دو دو کاریں رکھ سکتے ہیں۔ ان کا کوئی شوق یا مشغلہ ایسا نہیں ہے جس میں پیسہ خرچ ہوتا ہو۔ دولت لٹانا اور گھر پھونک تماشا دیکھنا کوئی ہنر بھی تو نہیں ہے۔ انھوں نے ساری عمر محنت سے پیسہ کمایا ہے، اس لیے انھیں اس کی قدر بھی ہے۔

آخر میں حفیظ صاحب کی ایک خصوصیت اور سن لیجیے:

حفیظ صاحب کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ کان اِدھر لائیے، چپکے سے اس سلسلے میں ایک بات سنیے۔ حفیظ صاحب اس قدر محتاط ہیں کہ انھوں نے کبھی کسی کو کھانے پر آنے کی تکلیف بھی آج تک نہیں دی۔

(۱۹۶۳ء)

ڈپٹی صاحب

ڈپٹی صاحب بڑے کلّے ٹھلّے کے آدمی تھے۔ قد لمبا، بدن دُہرا، سر پر مشین پھرواتے تھے اور تالو پر پان کھلواتے تھے۔ اس میں بالالتزام تیل ڈلواتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس سے دماغ میں تراوٹ آتی ہے۔ کشادہ پیشانی، گھنی بھنویں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، بیٹھی ہوئی پھلکی سی ناک، پھبتی باز کہتے تھے اس پر سے گاڑی کا پہیّا پھر گیا تھا۔ آنکھیں چپاں سی مگر بڑی بے قرار۔ ہم نے جب انھیں دیکھا تو ان کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ مونچھیں اتنی لمبی کہ گل مچھوں کو بھی مات کر گئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ جوانی کی ترنگ میں ڈپٹی صاحب ضرور ان پہ لیموں رکھتے ہوں گے۔ دلّی کے شرفا کے دستور کے مطابق ڈپٹی صاحب کو بھی بچپن سے ورزش کا شوق تھا۔ دیوان خانے میں مگدر، موگریوں کی جوڑی اور بگدر رکھے ہوئے تھے۔ دو سو ڈنٹر بیٹھکیاں نکالنا ان کا روز کا معمول تھا۔ ان کے بعد جوڑی ہلاتے اور مگدر پھراتے۔ محلّے میں اکھاڑہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں آ سکتے تھے۔ صرف بھلے آدمیوں کے بچے آتے تھے۔ استاد مرزا بیگ روزانہ صبح کو دو گھنٹے کے لیے آتے۔ پٹھوں کو لڑنت کراتے اور داؤ پیچ سکھاتے۔ ڈپٹی صاحب بھی اپنے لڑکپن میں استاد کے شاگرد ہوئے تھے۔ شاگرد کا جسم سڈول بنانے کے لیے استاد طرح طرح کی ورزشیں بتاتے تھے۔ انگرکھے پہننے کا عام رواج تھا۔ مگر یہ انگرکھے صرف ان پر سجتے تھے جن کے بدن کسرتی ہوتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کا گردنا تیار، چوڑا چکلا سینہ، چیتا سی کمر، پیٹ کمر سے لگا ہوا، بازوؤں کے پٹھے ابھرے ہوئے، بغل بچے ابھرے ہوئے۔ ڈپٹی صاحب پر انگرکھا ایسا چست بیٹھا تھا کہ جزوِ بدن ہو جاتا تھا۔

ڈپٹی صاحب کا شمار خوب صورتوں میں کبھی نہیں ہوا مگر ان کی وضع داری ہزاروں میں ایک تھی۔ چنی ہوئی دوپلی، سفید براق تن زیب کا انگرکھا، آڑا پاجامہ، آدھی پنڈلیوں تک چوڑیاں پڑی

qasarulkutub.blogspot.com

ہوئیں۔ پاؤں میں زرکار سلیم شاہی۔ بائیں ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوا۔ دائیں ہاتھ میں چاندی کے مُوٹھ کی چھڑی۔ دونوں ہاتھوں اور سر کے اشارے سے سلام لیتے۔ جب وہ شام کو بازار مٹیا محل سے چوک کا رُخ کرتے تو سب کی نظریں انھی پر لگی رہتی تھیں۔

ڈپٹی صاحب محکمۂ آب کاری میں انسپکٹر لیے گئے تھے۔ اب ترقی کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں للّو پنجو انگریز بھی نہیں آتے تھے۔ شریف گھرانوں کے انگریز افسر آتے تھے اور ہندوستانیوں کو ملازمت دینے سے پہلے ان کی شرافت اور خاندانی وجاہت کو ضرور جانچ لیتے تھے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔ اس لیے خوب ٹھونک بجا کر آسامی دیتے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے اپنی محنت و کارکردگی سے انگریز افسروں کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ وظیفہ یاب ہونے سے کئی سال پہلے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے مگر آخر تک ڈپٹی صاحب ہی کہلائے۔

گھڑسواری کا انھیں شوق تھا۔ ایک گھوڑا انھیں سرکار کی طرف سے ملا ہُوا تھا جو سرکاری دوروں میں کام آتا تھا۔ اس کے علاوہ کم از کم دو گھوڑے اور ان کی سواری میں رہتے تھے۔ مُنھ زور سے مُنھ زور گھوڑے کو ڈپٹی صاحب چنیں بُلوا دیتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کے ایک زمیندار دوست نے میرٹھ کی نوچندی سے ایک نقرہ خریدا تھا۔ یہ بچھیرا سواری کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے سوار کے سائے تک سے بھڑکتا تھا۔ زمیندار صاحب نے خُود بیسیوں گھوڑے ٹانگ تلے سے نکال دیے تھے مگر یہ بچھیرا ان کے قابو میں کسی طرح نہ آتا تھا۔ ڈپٹی صاحب سے اس کا ذکر آیا تو بولے۔ "ذرا ہم بھی اُسے دیکھیں۔" حکم کی دیر تھی۔ داروغہ اصطبل سے بچھیرے کو لے کر فوراً حاضر ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "کاٹھی یا زین کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف لگام رہنے دو۔" پھر قریب جا کر اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرا۔ بچھیرے نے اُچھل کُود دکھائی اور دولتی جھاڑی۔ چشم زدن میں ڈپٹی صاحب اس پر سوار تھے اور بچھیرا الف ہو رہا تھا۔ جب اپنے سوار کو پھینک نہیں سکا تو لے کر بھاگا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد دیکھا کہ گھوڑا اور سوار دونوں پسینے میں نہائے چلے آ رہے ہیں۔ بچھیرے کے نتھنے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ پھیپھڑی بندھی ہوئی تھی اور گردن لٹکی ہوئی تھی۔ ڈپٹی صاحب

نے لگام سائیس کو تھمائی اور زمیندار صاحب سے کہا۔ "یہ گھوڑا سواری کے کام کا نہیں ہے۔ آپ اسے اپنے دو پہیے یا بگھی میں لگائیے۔" زمیندار صاحب نے کہا۔ "کوئی وجہ تو معلوم ہو آخر کیوں؟" ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "یہاں آیئے۔ ذرا اِس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیریے۔" انھوں نے ہاتھ پھیرا تو گھوڑا بِدکا۔ ڈپٹی صاحب نے پُوچھا۔ "کیا دیکھا؟"

"بس یہ دیکھا کہ ہاتھ پھیرنے سے گھوڑا بِدکتا ہے۔"

"کیوں بِدکتا ہے؟"

"میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ آپ بتایئے۔"

"آپ کے ہاتھ نے کوئی غیر معمُولی بات محسُوس کی ہے؟"

"نہیں۔"

"یہ دیکھیے، عین بیچوں بیچ کمر کا ایک مُہرہ اُبھرا ہُوا ہے۔"

زمیندار صاحب نے ہاتھ پھیر کر مُہرے کو چُٹکی میں لینا چاہا تو گھوڑا اُچھلا۔ بولے:

"ہاں صاحب ہے۔"

"بس یہ گھوڑا اسی وجہ سے سواری نہیں دیتا۔ میں نے اس پر سوار ہونے سے پہلے اِس عیب کو دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے ذرا پیچھے ہٹ کر سوار ہُوا تھا۔ اس کا یہ عیب دُور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ اسے جوتنے کے کام میں لیجیے۔"

ہم نے خود تو دیکھا نہیں، ہاں دیکھنے والوں سے سُنا ہے کہ جوانی میں ڈپٹی صاحب گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے اور جب کسی مضبوط درخت کے نیچے سے نکلتے تو اُس کے گُدّے میں مع گھوڑے کے لٹک جاتے۔

ڈپٹی صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ ان کا نشانہ اتنا سچا تھا کہ چھوٹی دوّانی کو اُچھال کر رفل کی گولی سے اُڑا دیتے تھے۔ شیر کا شکار مچان پر سے کبھی نہیں کھیلا۔ کہتے تھے کہ "یہ تو لونڈیوں کا کھیل ہو گیا کہ ایک دن کٹڑا باندھ دیا۔ رات کو شیر آ کر اُسے مار گیا۔ اس کے گارے پر اگلی رات کو شیر ضرور آئے گا۔ لہٰذا مچان پہ جا بیٹھے اور شیر آیا تو اُسے مار لیا۔ بھلا اس میں کیا لُطف آیا۔ جب تک خطرے میں اپنی جان نہ ڈالی جائے، شکار کا

qasrulkutub.blogspot.com

مزا نہیں آتا تھا۔ لہٰذا ڈپٹی صاحب ہمیشہ زمین پر ہی سے شیر کا شکار کھیلتے تھے۔ جنگل میں اپنے ساتھ بکری کا ایک سفید بچّہ لے جاتے۔ سفید اس لیے کہ اندھیرے میں بھی کچھ نہ کچھ دکھائی دیتا رہے۔ اسے ایک درخت سے باندھ دیتے اور خود ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ جاتے۔ بکری کا بچّہ اکیلا رہ جاتا تو چیخنا شروع کر دیتا۔ تھوڑی دیر بعد جنگلی چرندوں اور پرندوں کی مخصوص آوازوں سے ڈپٹی صاحب کو معلوم ہونے لگتا کہ جنگل کے بادشاہ کی سواری آ رہی ہے۔ نقیب با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار کی صدائیں لگا رہے ہیں۔ اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ شیر اب یہاں آگیا اور اب یہاں۔ ڈپٹی صاحب کی نگاہ اب اُدھر ہے۔ لو اب بکری کے بچّے کی آواز بند ہو گئی اور اس کے سارے بال سیہہ کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ جھاڑی کی اوٹ میں سے شیر کا چہرہ نمودار ہُوا ہی تھا کہ ایک گولی اُس کے ماتھے پر پڑی۔ شیر کئی گز اُوپر کو اُچھلا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب نے ریسٹ ہاؤس میں آکر آدمیوں کو بھیج دیا کہ جا کر شیر کو اُٹھا لائیں اور بکری کے بچّے کو بھی کھول لائیں۔

ایک دفعہ کلکٹر صاحب کے ایک دوست شیر کا شکار کھیلنے آئے۔ اُن کے لیے ہاتھیوں اور ہانکے کا انتظام کیا گیا۔ یہ ہاتھی شیر کے شکار کے لیے سدھائے گئے تھے۔ ایک پر کلکٹر صاحب اور ان کے شکاری دوست سوار ہوئے۔ دُوسرے پر ڈپٹی صاحب، اور تیسرے پر پیشہ ور شکاری تھے۔ جنگل کے ایک کھُلے حصّے میں ایک ٹیکری پر تینوں ہاتھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کھڑے تھے۔ ہانکا شروع ہُوا۔ ڈھول اور کنستر پیٹے جا رہے تھے اور شور مچایا جا رہا تھا۔ جنگل کے جانور گھبرا گھبرا کر بھاگے چلے آ رہے تھے اور ہاتھیوں اور آدمیوں کو دیکھ کر اِدھر اُدھر چھلانگیں بھرتے نکلے جا رہے تھے۔ جنگل کا بادشاہ اپنی میٹھی نیند سے اس بدتمیزی سے جگائے جانے پر جھنجلا کر اُٹھا اور شور و شغب کی دُوسری سمت میں روانہ ہو گیا۔ جب کھُلی جگہ میں پہنچا تو اپنے راستے میں ہاتھیوں کو حائل پایا۔ زمین کی طرف مُنھ کر کے زور سے دہاڑا۔ سارا جنگل لرز گیا۔ انگریز مہمان نے سرکس کے نیم جان شیر دیکھے تھے۔ اب جو جنگل کے شیر کو دیکھا اور اُس کی ڈانٹ سُنی تو ہاتھ سے رفل چھُوٹ کر گر پڑی اور خود "ٹائیگر ٹائیگر" کہتے بے ہوش ہو گئے۔ کلکٹر صاحب نے گولی ماری تو اوچھی پڑی۔ بجلی کی طرح تڑپ کر شیر کلکٹر صاحب

کے ہاتھی کے پُٹھے سے آ چمٹا۔ ہاتھی نے چیخ مار کر اپنی سُونڈ ہوا میں اُچھالی، مگر شیر تک اُس کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ڈپٹی صاحب اُس وقت فائر نہ کریں تو شیر نے کلکٹر صاحب اور ان کے مہمان کا کام تمام کر دیا تھا۔ شیر گر گیا مگر اس ہلّے میں اُس نے ہاتھی کے کولھے پر سے من ڈیڑھ من گوشت اُتار لیا تھا۔ ہاتھی نے زخمی شیر کو اپنی سُونڈ میں لپیٹ کر زمین پر دے مارا اور اپنے پیروں سے اُسے رَوند کر بے ہنگم سا ڈھیر بنا دیا۔

ڈپٹی صاحب کے شکار کے کئی قصّے مشہور ہیں۔ آدم خور شیر، خُونی ریچھ، مست ہاتھی اور مگرمچھ، سبھی اُن کی گولی کا شکار ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ چار ڈاکو اُن کے گھر میں گھُس آئے۔ کھٹکا سُن کر اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ دیکھا کہ دو آدمی کوٹھری میں گھُس رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے لپک کر کوٹھری کی باہر سے کُنڈی لگا دی۔ اتنے میں پلٹ کر جو دیکھتے ہیں تو دو ڈاکو ڈھاٹے باندھے ان پر چڑھے چلے آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب ان دونوں سے گتھم گتھا ہو گئے اور موقع ملتے ہی ان دونوں کے سر اس زور سے ٹکرائے کہ دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یوں چاروں ڈاکوؤں کو اکیلے ڈپٹی صاحب نے زیر کر لیا۔

اب ان واقعات کو کم و بیش چالیس سال ہو گئے۔ ڈپٹی صاحب پنشن پاتے تھے اور اللہ اللہ کرتے تھے، کہ مُلک کی سیاسی فضا خراب ہونی شروع ہو گئی۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہونے لگے۔ مطالبہ پاکستان مان لیا گیا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ اُس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور ہندوؤں کے تعصب کی آگ اور بھڑک اُٹھی۔ بھارت میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ لکھوکھا مسلمان کِسی نہ کِسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ گئے۔ انھی میں ڈپٹی صاحب بھی اپنی ساری عمر کی کمائی بیس ہزار کے نوٹ لے کر پالم کے ہوائی اڈّے پر پہنچے۔ اُن کی بیگم نے کہا۔ "لاؤ نوٹ مجھے دو۔ میں انھیں اپنے نیفے میں سی لُوں۔" ڈپٹی صاحب کا سامان ٹٹولا گیا، خود ان کی تلاشی لی گئی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اپنی بیگم کی ذکاوت پر دِل ہی دِل میں خوش ہو رہے تھے کہ ایک وردی پوش عورت قضائے مبرم کی طرح نمودار ہُوئی اور بیگم کو اندر لے گئی۔ وہاں سے بیگم جب برآمد ہُوئیں تو ان کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ پاؤں ڈالتی کہیں تھیں اور پڑتا کہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب سمجھ گئے کہ اُن پر کیا گزری، مگر خاموش رہنے ہی میں عافیت دیکھی۔ بیگم دھم ہو کر رہ گئی تھیں۔

qasarulkutub.blogspot.com

جب جہاز میں سوار ہو گئے اور جہاز اُڑ گیا تو ان کا خوف اور صدمہ کچھ کم ہُوا اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ڈپٹی صاحب نے بہت سمجھایا۔ اتنا سمجھایا کہ خود بھی آب دیدہ ہو گئے۔ مگر بیگم کو بیٹی کی جدائی کا دھکا کچھ ایسا بیٹھا کہ گُم صُم ہو کر رہ گئیں۔ کراچی میں بیٹی داماد نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے لیے آنکھیں بچھائیں، مگر بیگم اپنے اوسانوں میں نہ آئیں اور ایک دن ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور چند گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

ڈپٹی صاحب ہمّت کے آدمی تھے مگر دس بیس نہیں، اکٹھے پچپن برس کا ساتھ تھا۔ بڈھے کی بیوی مر جائے تو بڈھے کی مٹّی پلید ہے۔ پہلے روپیہ گیا، پھر بیوی گئی۔ عمر کے ساتھ ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے۔ نماز پڑھتے اور آہ و زاری کرتے کہ "یا اللہ! مجھے بھی جلد اُٹھا لے۔" سعادت مند بیٹی اور داماد ان کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے، مگر ڈپٹی صاحب پُرانی وضع کے بڑے نکیلے آدمی تھے۔ وہ اس غم میں گھلے جاتے تھے کہ ہائے! میں بیٹی کے ٹکڑوں پر پڑا ہُوا ہوں، اِس سے تو موت اچھی۔ مگر موت بھی تو اپنے اختیار میں نہیں۔ فرماتے تھے، "شاید قسمت میں ابھی اور ذِلّتیں اُٹھانی لکھی ہیں۔"

ڈپٹی صاحب اب اَسّی کے پیٹے میں آ گئے تھے۔ وُہی ڈپٹی صاحب تھے جو تیر کی طرح سیدھے تھے، اب کمان کی طرح جُھک گئے تھے۔ دونوں آنکھیں بن چکی تھیں اور ان پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھ گئی تھی۔ اُونچا سُننے لگے تھے۔ ایک دفعہ میں بات نہیں سمجھتے تھے۔ سیاہ گل مچھوں کی جگہ سفید گول بڑی سی ڈاڑھی نے لے لی تھی۔ گٹھیا نے جوڑوں کو جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ طبیبوں کا مشورہ تھا کہ چلتے رہو۔ بیٹھ گئے تو پھر اُٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ لہٰذا ڈپٹی صاحب روزانہ صبح شام لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے۔ دس بیس قدم چلتے اور بیٹھ جاتے۔ پھر چلتے پھر بیٹھ جاتے۔ غرض یُوں ہی اُٹھتے بیٹھتے گھر سے بازار تک ہو آتے۔

پچھلے سال جاڑوں میں ڈپٹی صاحب کو دیکھا کہ ایک ڈھیلا ڈھالا سا میلا اوور کوٹ پہنے لکڑی کے سہارے ڈگمگاتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ پوچھا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟" میں نے نام بتایا۔ بولے۔ "ایں؟" میں نے اونچی آواز میں پھر نام بتایا۔

کہنے لگے، "بھئی ہماری خیر خبر لیتے رہا کرو میاں شاہد۔ ہم پکے پان ہیں، نہ جانے کب بُلاوا آ جائے۔"

میں نے کہا۔ "میں حاضر ہوں۔ لائیے رکابی مجھے دیجیے، میں لیے چلتا ہوں۔"

نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بولے۔ "اچھا لے لو، تمھیں زحمت تو ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "جی بالکل نہیں۔ بلکہ عین سعادت۔"

بولے۔ "کیوں نہ ہو۔ دِلّی والے ہو، اور ادیب ہو! تمھارے دادا مجھے یوں یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو۔" اور پُرانی باتیں کرتے مِسکیاں لیتے وہ گھر تک پہنچ گئے۔ گھر کیا تھا، کوارٹر کے برآمدے میں ٹاٹ کے پردے ڈال کر کوٹھری سی بنالی تھی۔ اسی میں اُن کا جھلنگا پڑا ہُوا تھا جس پر بوسیدہ سی توشک اور مَیلا سا لحاف پڑا تھا۔ ایک ٹوٹی ہُوئی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، آج ہم تمھیں ایک مزے دار کہانی سُناتے ہیں۔ جی چاہے تو کبھی لکھ بھی دینا۔ لاؤ۔ یہ رکابی مجھے دو۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیجیے۔" میں نے اب دیکھا کہ رکابی میں مکئی کی روٹیاں تھیں اور ان پر سرسوں کا ساگ رکھا ہُوا تھا۔

میں نے کہا۔ "حضرت سلامت، یہ آپ کہاں سے لے آئے اور اسے آپ کیسے کھائیں گے؟" ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "ارے بھائی یہی تو بتانے کے لیے تمھیں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ سُنو:

آج جب میں بازار سے لوٹا تو حسبِ معمُول رُکتا رُکاتا چلا آ رہا تھا۔ راستے میں جہاں ایک جھونپڑی ہے نا، وہاں دم لینے کے لیے میں ایک پتھر پر ٹک گیا۔ کھانسی زور سے اٹھی، اتنی کہ سانس بے قابو ہو گیا۔ کھانسی اور ہائے ہائے کی آواز سُن کر جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر ایک عورت نے جھانکا۔ "ارے، بے چارا بابا تھک گیا۔ بھوک لگی ہے؟" یہ کہہ کر جھونپڑی میں اندر چلی گئی۔ پھر جلدی سے واپس آ کر بولی، "بابا، جائیو مت۔" میں نے ابھی ہنڈیا اتار کر توا رکھا ہے۔" وہ پھر چلی گئی۔ میرے دِل میں خیال آیا کہ یہ عورت مجھے فقیر سمجھ رہی ہے۔ کیا اللہ کی شان ہے! یہ بڑھاپا نہیں، بُرا آیا ہے۔ اور مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ بہت ضبط کیا مگر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے میں اس نے پردے میں سے ہاتھ بڑھا کر ایک پیڑھی میرے آگے ڈال دی۔ "لے اس پر بیٹھ جا۔ پتھر ٹھنڈا ہو گا۔" پھر میرے آنسو بہتے

qasaurdukitutub.blogspot.com

دیکھ کر جیسے بچّے کو چمکارتے ہیں، چمکار کر بولی۔ "رو مت بابا۔ میں تجھے گرم گرم روٹی کھلاؤں گی اور ہاں سرسوں کا ساگ بھی ہے۔ بس ابھی لائی۔"

اپنی زبوں حالی پر شرمندگی و تأسّف تو ہو ہی رہا تھا کہ اللہ! اب ہم ایسے ہو گئے کہ لوگ ہمیں فقیر سمجھ کر بھیک کے ٹکڑے دینے لگے! غیرت نے للکارا اور طبیعت میں بڑی جھونجھل آئی۔ وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی کہ اس کے روٹی لانے سے پہلے چلا جاؤں مگر اس عورت کی ہمدردی اور خلوص نے ایک ایک پاؤں من من بھر کا کر دیا۔ دل نے کہا۔ اس تماشائے عبرت کا آخری سین بھی دیکھ لو۔

ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ ایک مٹی کی رکابی میں مکئی کی دو سوندھی سوندھی روٹیاں اور ان پر بھاپیں اٹھتا ہوا سرسوں کا ساگ رکھا ہوا نظر آیا۔

"لے بابا، کھا لے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر رکابی لے لی۔

عورت نے کہا۔ "یہیں بیٹھ کر کھا لے، میں تیرے لیے پانی لاتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "نہیں بیٹی، میں گھر لے جاؤں گا۔ وہیں جا کر کھاؤں گا۔" میرے آنسو بہنے لگے۔ اس عورت نے چمکار چمکار کر کہا۔ "اچھا تو گھر لے جا۔ رووے مت نہ۔ تیرا گھر کہاں ہے؟ لائیں تیرے گھر پہنچا دوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں بیٹی، میں خود چلا جاؤں گا، تمھاری یہ رکابی شام کو دے جاؤں گا۔"

عورت نے کہا۔ "نا۔ واپس نہ کیجیو، میرے گھر اور بہتیری ڈھوریاں ہیں گی، جو تیرا جی چاہے تو اگلی نوچندی جمعرات کو آ جائیو۔ جب سے میرا منا ہٹا ہے میں نوچندی جمعرات کو ایک وقت کا کھانا اللہ نام کا نکالوں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا بیٹی، اللہ تجھے بہت سا دے، جو میں جیتا رہا ضرور آؤں گا۔"

بس میاں، میں وہیں سے چلا آ رہا تھا کہ تم راستے میں مل گئے۔"

ڈپٹی صاحب اتنا کہہ کر رونے لگے۔ یہ وہی ڈپٹی صاحب تھے جن کے پیشاب میں چراغ جلتا تھا۔ اور جو زمین میں ٹھوکر ماریں تو پانی نکل آتا تھا۔ آج ان کا یہ بڈرا ہو گیا تھا کہ

لوگوں کو ان پر ترس آتا تھا، اور جھونپڑی والی عورت نے انھیں اللہ والا سمجھا۔ میں نے کہا۔ "ڈپٹی صاحب اس عورت کی بھلمنساہٹ میں تو کوئی شبہ نہیں مگر یہ سخت روٹیاں بھلا آپ سے کیا کھائی جائیں گی؟"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ گھر میں سے ڈپٹی صاحب کی بیٹی کی آواز آئی۔

"ابّا جی، میز پر کھانا لگا دیا گیا ہے، آ جائیے۔"

ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "بیٹی! آج تو ہم اللہ کے مہمان ہیں۔"

ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کھڑکی میں آ کر بولیں۔ "جی ابّا جی۔"

ڈپٹی صاحب بولے۔ "آج تو ہم یہ کھائیں گے، یہ دیکھو۔"

بیٹی نے کہا۔ "اے ہے یہ کیا؟ یہ ٹکڑے بھلا آپ سے کھائے جائیں گے؟ کہاں سے لے آئے ہیں انھیں؟ اور یہ سرسوں کا ساگ! یہاں تک آ رہی ہے تیل کی بھکر، توبہ!"

ڈپٹی صاحب نے پُرعزم آواز میں کہا۔ "ہم تو بھائی آج یہی کھائیں گے۔ اللہ نے یہ کھانا ہمیں دلوایا ہے، ہمارے لیے تو یہی من و سلویٰ ہے۔" بیٹی نے کہا۔ "اے ہے ابّا جی۔ لائیے مجھے دیجیے۔ اس کے کھانے سے آپ کا جی خراب ہو جائے گا۔ میں نے آپ کی گھی کی روٹی پکا دی ہے۔ آ جائیے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

مگر ڈپٹی صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور روٹی کا ٹکڑا توڑ کر ساگ لگا کر کھانے لگے۔ نوالہ ان سے کیا چبتا؟ چبا چبا کر کھٹ تک ہو گیا تھا، مگر وہ اسے زہر مار کرتے رہے اور روتے رہے۔ بمشکل دو ایک نوالے حلق سے اتارے اور پانی پی کر بولے۔ "الحمدللہ! آج بھیک کے ٹکڑوں کا مزہ بھی چکھ لیا۔"

ان کی بیٹی کی تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے مگر لحاظ میں کچھ نہ کہہ سکتی تھیں، جانتی تھیں کہ ابّا جی کو ضد سوار ہو جاتی ہے تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ یہ اپنی من مانی کیے بغیر نہیں مانتے۔ ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں۔ ڈپٹی صاحب نے بیٹی کی طرف رکابی بڑھا کر کہا۔ "لو بھئی، اسے خالی کر لاؤ۔ شام کا انتظار کون کرے۔" اور خالی رکابی لے کر لکڑی ٹیکتے ہوئے ڈپٹی صاحب روانہ ہو گئے، خدا جانے اس وقت ماضی کی دنیا میں کہاں پہنچے ہوئے تھے کہ بار بار اس دوہے کو دہرا رہے تھے:

ان نینوں کا یہی بسیکھ — وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

(۱۹۷۰ء)

نفاست حسین

میری گلی کے نکڑ پر ایک کوارٹر کی توڑ پھوڑ شروع ہوئی۔ اس زمانے میں ہماری کالونی کی منتظم سوسائٹی بڑی فعال ہو گئی تھی۔ ذرا کسی نے اپنے کوارٹر کے آگے چبوترا بنایا اور سوسائٹی سے مزدوروں کا ایک دستہ آیا اور کدالیں مار کر چبوترے کو توڑ گیا۔ اب جو ایک سالم کوارٹر کی ڈھائی ڈھوئی دیکھی تو معاً مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ پورا کوارٹر ہی کسی نے ناجائز بنا لیا تھا۔ جسے سوسائٹی والے اب ڈھوا رہے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دو ڈھائی ہزار کوارٹر تو خود سوسائٹی نے بنوا کر دیے ہیں۔ ایک محلّہ دار سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوارٹر بک گیا ہے، اور جن صاحب نے خریدا ہے وہ اسے دوبارہ بنوا رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اس کے ملبے پر نئی تعمیر شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو منزلہ خوشنما عمارت تیار ہو گئی۔ مکان سے مکین کا اندازہ ہو گیا۔ دروازہ پر نام کی تختی لگ گئی "نفاست حسین صدّیقی"۔

کراچی کی بے تعلقی اور نفسا نفسی مشہور ہے۔ ایک فلیٹ میں رہنے والے کو اس کا علم نہیں ہوتا کہ برابر والے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔ جب اس شہر کا دستور یہی ہے تو اپنا بھی یہ حال ہے کہ دو کوارٹر آگے کی خبر نہیں کہ کون رہتا ہے، بس اپنے کام سے کام : ؎

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ میرے سامنے جو کوارٹر ہے، اس میں کوئی صاحب آکر آباد ہوئے، بس اتنا معلوم ہوا کہ گوالیار کے کوئی صاحب ہیں، ڈاکٹر صاحب کہلاتے ہیں۔ مگر دوا درمن کے ڈاکٹر نہیں۔ دِن گزرتے گئے، مہینے گزرتے گئے۔ سال گزرنے کی نوبت آگئی۔ روزانہ دن رات میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈاکٹر صاحب سے بیسیوں بار آمنا سامنا ہوتا۔ وہ

مجھے دیکھتے ہوئے گزر جاتے اور میں اُنھیں۔ علیک سلیک کی بھی نوبت نہ آئی۔ انھوں نے مجھ سے ملنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تو میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان پر کیوں تھوپتا۔ غرض اسی مغائرت میں دِن گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دِن صبح کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں اور دیوان خانے میں بٹھا دیے گئے ہیں۔ دیوان خانے کی کیفیت بھی سُن لیجیے۔ میرے کوارٹر میں صرف دو کمرے ہیں۔ ایک مستقلاً بیوی بچوں کے تصرف میں رہتا ہے۔ دُوسرا کمرہ دن میں "ساقی" کا دفتر اور دیوان خانہ بن جاتا، رات کو بیڈ رُوم بن جاتا۔ اگر کسی کی دعوت ہوتی ہے تو ڈرائنگ رُوم بن جاتا ہے۔ اگر موسیقی کی محفل ہوتی ہے تو میوزک ہال بن جاتا ہے، اور اگر کوئی مہمان آ جاتا ہے تو مہمان خانہ۔ گھُس گھُس میرے کان میں گھُس! — چوپایل میں سماتا نہیں دُم سے باندھے چھاج اور مجھے اس طالب علم کا قصہ یاد آ جاتا ہے جس کا ایک تہمد چوری ہو گیا تھا تو اُس نے تھانے میں اپنی ۲۲ چیزیں چوری جانے کی رپٹ درج کرائی تھی۔ کیوں کہ اس تہمد کے ۲۲ مصرف تھے۔ لُنگی، پگڑی، بستر، بوغبند، چادر، جانماز، دسترخوان وغیرہ وغیرہ۔ اپنا بھی کچھ یہی حال تھا۔

کیا کہوں میں اپنے گھر کا حال — اس خرابی نے کر دیا پامال

ہاں تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب دیوان خانہ میں آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا۔ "آج کیا جاتی دُنیا دیکھی"

بچّوں نے کہا۔ "بُلا رہے ہیں آپ کو۔"

میں نے کمرے میں داخل ہو کر مؤدّبانہ سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ مزاج پُرسی کی، اور ہم دونوں اس قدر رفاقت سے ملے گویا ہم سے زیادہ رفاقت دو دوستوں میں بھلا کیا ہوگی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے ایک خط دیا۔ یہ خط مشہور انشا پرداز ل احمد صاحب کا تھا۔ انھوں نے کلکتہ سے ڈاکٹر صاحب کو لکھا تھا کہ آپ کوارٹر نمبر ۱۹۱۰ میں ہیں اور شاہد صاحب نمبر ۱۹۰۶ میں۔ مگر نہ تو آپ نے کبھی کسی خط میں شاہد صاحب کا تذکرہ کیا اور نہ شاہد صاحب نے آپ کا۔ یہ کیا معمّا ہے! اگر آپ حضرات اس قُرب کے باوجود اب تک نہیں ملے ہیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہوگا۔ اپنی ندامت کو چھپانے کے لیے ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اس خط کے بعد ڈاکٹر صاحب سے واقعی مخلصانہ دوستی ہو گئی۔ آپ سمجھے بھی یہ ڈاکٹر صاحب کون تھے؟ یہ تھے ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی۔ علامہ نیاز فتح پوری کے پُرانے دوست اور "نگار" کے مضمون نگار۔ نہایت ستھرے ادبی

qissarulkutub.blogspot.com

ذوق کے مالک! اور دل احمد وہی لطیف الدین احمد اکبر آبادی ہیں۔ جنھوں نے موؔر کی مثنوی لالہ رُخ کا ترجمہ کرکے شہرتِ دوام و بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی اور یہ دونوں حضرات یارانِ نجد میں بھی شامل تھے جنھوں نے اب سے چالیس سال پہلے "ادبِ لطیف" کی داغ بیل ڈالی تھی۔

اچھا تو ذکر تھا نفاست حسین کا۔ کئی سال تک اس سے زیادہ معلوم نہ ہوا کہ یُوپی کے کسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور پیچھے والے آدمی ہیں۔ کراچی کی بے تعلقی ان سے بھی ملنے میں حائل رہی یہاں تک کہ مارشل لا کے نفاذ سے پہلے کا زمانہ آیا۔ ملک فیروز خان نون کی وزارتِ عظمیٰ کا عمل دخل تھا۔ ان کے ایک قریبی عزیز اپنے افسروں کو پھلانگتے ہوئے کراچی کے پولیس چیف بن گئے تھے۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ انھوں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے محلہ کمیٹیاں بنانے کا ڈول ڈالا۔ شدہ شدہ ہمارے محلے میں بھی ایک کمیٹی قائم کرنے کے لیے پولیس والوں نے ایک جلسہ کیا اور پولیس کے کرگوں نے نام بنام سب کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات، مجھے بھی حاضر ہونا پڑا۔ محلہ کمیٹیوں کے جو مقاصد بیان کیے گئے وہ اچھے ہی تھے۔ محلے میں امن و امان قائم رکھنا، چھوٹے موٹے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا، بدمعاشوں اور بدکرداروں کی اطلاع پولیس کو دینا۔ غرض ہر لحاظ سے پولیس کی نیابت کرنا۔ جب محلہ کمیٹی کے لیے نام مانگے گئے تو کسی نے میرا نام بھی لکھوا دیا۔ میں نے بہت رسیاں تڑائیں مگر میری ایک نہ چلی۔ اور ایک دن میرے نام ایک ہم محلہ کا پروانہ آگیا کہ آج رات کے نو بجے محلہ کمیٹی کی میٹنگ میرے گھر پر ہے جس میں علاقے کے ڈی، ایس، پی صاحب خطاب کریں گے۔

نظام صاحب کے گھر پر دس بارہ حضرات جمع ہوئے۔ صاحبِ خانہ نے سب کا تعارف کرایا۔ یہیں نفاست صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ بڑے زندہ دل آدمی نکلے۔ بات بات پر کھلے پڑتے تھے۔ تیس کے قریب عمر تھی۔ اونچا قد، چھریرا ڈیل، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، بے قرار آنکھیں۔ ان پر سنہرے فریم کی عینک۔ ستواں ناک۔ موزوں دہن۔ گول ٹھوڑی۔ کلین شیو۔ انگریزی اور اردو ملا کر بولتے تھے اور ہنسی کے فوارے چھوڑتے جاتے تھے۔ اس سارے اجتماع میں اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے سب سے نمایاں شخصیت انھی کی تھی۔ معلوم ہوا کہ نظام صاحب اور نفاست صاحب نے مل کر چھاپہ خانہ اور کتابوں کا کاروبار شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے کاروبار تیز تا چلا جا رہا ہے۔

ان دونوں ذہین اور محنتی نوجوانوں کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ ورنہ جو لوگ بھارت میں اپنا سب کچھ گنوا کر آئے ہیں، ان میں سے بیشتر اپنی عمر اس نقصان کے سوگ میں بسر کر رہے ہیں۔ نفاست صاحب جس قدر شوخ و شنگ تھے، نظام صاحب اسی قدر سنجیدہ و بُردبار، اجتماعِ ضدّین کے بندھن میں جکڑے ہوئے تھے۔

ڈی، ایس، پی صاحب آئے اور ساتھ علاقے کے انسپکٹر اور سب انسپکٹر بھی آئے۔ محلہ کمیٹی کے مقاصد بیان کیے گئے۔ کمیٹی کے فرائض و اختیارات دریافت کیے گئے۔ بہت سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ ڈی، ایس، پی صاحب، بڑی شرافت سے جوابات دیتے رہے۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ اب کسی اہلِ محلہ کو تھانے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تمام جھگڑے اور شکایتیں محلہ کمیٹی ہی آئندہ نمٹایا کرے گی۔ مگر میں پولیس کے نام ہی سے الرجک ہوں، بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ کب یہ جلسہ برخاست ہو اور میں خیر سے اپنے گھر سدھاروں۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد محلہ کمیٹی کی باقاعدہ تشکیل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے صدر کے لیے نام مانگا گیا۔ تین چار آوازوں میں میرا نام لیا گیا۔ میں نہیں نہیں ہی کرتا رہا اور سب نے گونتھ گانتھ کے میرا نام ہی لکھوا دیا۔ میں نے اپنے غائبانہ قدردانوں کا شکریہ ادا کیا، اور عرض کیا کہ میں اس عہدے کے لیے قطعی ناموزوں ہوں۔ کچھ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ اپنی افتادِ مزاج کے سبب۔ ڈی، ایس، پی صاحب نے بڑی شرافت سے پوچھا: "آخر آپ کو صدر بننے پر اعتراض کیا ہے؟"
مجھے سہارا آگیا۔ میں نے کہا۔ "میں پولیس کا کُتّا نہیں بن سکتا۔"

اس جواب پر چاہیے تو یہ تھا کہ ڈی، ایس، پی صاحب ناراض ہو کر مجھے کسی الزام میں گرفتار کر لیتے۔ مگر انھوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے کہا۔ "ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا: "میں یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنے محلے والوں کی خفیہ شکایتیں آپ کو پہنچاتا رہوں۔ میں تھانے میں حاضری نہیں دے سکتا۔ آپ کے وقت ناوقت طلب کرنے پر پیش نہیں ہو سکتا۔"

انھوں نے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ صرف ٹیلی فون کر دیں، میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ غرض:

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

qasrulkutub.blogspot.com

نظام صاحب کو سیکرٹری بنایا گیا اور نفاست صاحب منجملہ دیگر حضرات کے مجلسِ عاملہ کے ممبر بنے۔ اس کمیٹی کے جلسے ہفتہ وار یا حسبِ ضرورت ہونے لگے۔ مگر ان جلسوں میں ع

نشستند و خوردند و برخاستند

کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔ کیوں کہ ہمارے محلے میں جو بہتّر کوارٹر ہیں، ان میں خدا کے فضل سے سب بھلے لوگ آباد ہیں اور اللہ بھلا کرے بے تعلقی کا کوئی کسی سے ملتا جلتا ہی نہیں، جو جھگڑا ہو۔ جہاں دو برتن ہوتے ہیں، آپس میں کھڑک ہی جاتے ہیں۔ مگر یہاں ع

کسے را با کسے کارے نباشد

وہاں تو سنّاٹا ہی رہتا ہے۔ اس محلہ کمیٹی سے بس اتنا فائدہ ہوا کہ محلے کے دس بارہ افراد میں دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ نتیجہ یہ کہ کمیٹی کے جلسے باری باری سے مجلسِ عاملہ کے ممبروں کے ہاں ہونے لگے۔ جس کے ہاں جلسہ ہوتا وہ یا تو ضیافت کا اہتمام کرتا یا کم از کم بھاری چائے کا۔ کھلانے پلانے میں نفاست صاحب اور نظام صاحب بڑے دبنگ تھے۔ چند مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد پھر کوئی نئی حکومت بن گئی تو وزیرِ اعظم کے ساتھ اس کے لواحقین بھی چلتے کیے گئے اور محلہ کمیٹیاں اپنی موت آپ مر گئیں۔ مگر احباب کا جو حلقہ قائم ہوگیا تھا وہ بدستور قائم رہا۔

اب جو حلقہ قائم ہوا تھا، وہ پولیس کا بنایا ہوا نہ تھا بلکہ دوستوں کا تھا۔ اس کی بنیاد خوف و ہراس پر نہیں، محبت و اخوّت پر تھی۔ اس حلقے کے شیرازہ بند عزیز صاحب تھے۔ یہ صاحب تمام ممبروں سے کم عمر تھے اور محلّہ کے بڑے سرگرم کارکن۔ تھے تو سرکاری ملازم، مگر ملازمت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ خدمتِ خلق کو یہ ہر کام پر ترجیح دیتے تھے۔ پہلے انھوں نے ہفتہ وار دعوتوں کا سلسلہ یوں شروع کیا کہ تمام ممبر اپنے اپنے گھروں سے اپنا اپنا کھانا لے کر آئیں، اور کسی ایک ممبر کے ہاں جمع ہو کر کھائیں۔ یہ تجویز بڑی کامیاب رہی۔ ایک تو یہ کہ دسترخوان پر بیسیوں قسم کے کھانے جمع ہو جاتے، دوسرے یہ کہ زیادہ مقدار میں۔ کیوں کہ اس میں نمود کا عنصر شامل ہوگیا تھا۔ اس بیشی کو متناسب کرنے کے لیے یہ طے ہوا کہ اگر کوئی صاحب اپنے ساتھ ایک آدھ مہمان لانا چاہیں تو اطلاع دے کر لے آئیں۔ چناں چہ مہمان بھی شریک ہونے لگے۔ اور بیس پچیس افراد کا اجتماع ہونے لگا۔ اس یگانگت اور دل چسپ صحبت کو دیکھ کر مہمانوں کی آنکھیں پھٹیں اور وہ رشک سے کہتے کہ کاش ہمارا بھی

کوئی ایسا محلہ ہوتا۔

دلّی میں جب ۱۹۴۰ء کے بعد جنگ کے باعث غیر معمولی حالات پیدا ہوگئے تھے تو ہم نے ایک دن محلے کی مسجد میں بعد از نمازِ عشا محلے والوں کو جمع کیا۔ اور حالات کے پیشِ نظر ایک انتظامی مجلس بنائی تھی۔ جن کے پاس پیسہ تھا انھوں نے پیسہ دیا اور جو ہاتھ پاؤں سے خدمت کر سکتے تھے ان کی ایک والنٹیئر کور بن گئی تھی۔ کئی سو روپے کا غلّہ خرید کر محلّے والوں نے میرے گھر میں رکھوا دیا تھا تاکہ نایابی کے زمانے میں اہلِ محلّہ کے کام آسکے۔ وہاں بھی ایک مجلسِ عاملہ بن گئی تھی اور ہفتے کے ہفتے کسی ایک ممبر کے ہاں جمع ہو کر کھانا کھایا جاتا تھا اور شہر اور محلّہ کی سیاست پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ محلّہ داروں نے از راہِ تفنّن ہماری انجمن کا نام "انجمنِ شکم پروراں" رکھ دیا تھا۔ یہاں بھی ایک ویسی ہی انجمن بن گئی تھی اور محلّے والے اسے "پیٹ بھروں کی انجمن" کہنے لگے تھے۔ کھانوں کا یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔

انسان کسی حالت پر قانع نہیں رہتا۔ اب یہ ہوا کہ اس کا ڈھرّا بدلنا چاہیے۔ چناں چہ یہ طے پایا کہ باری باری سے دوستوں کے ہاں دعوت ہوا کرے۔ لہٰذا یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان دعوتوں کی روحِ رواں نفاست حسین ہوا کرتے تھے۔ مزے مزے کی باتیں کر کے خوب ہنستے ہنساتے۔ میری باری آئی تو نفاست صاحب نے کہا۔ "شاہد بھائی کے ہاں صرف کھانا نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "نہیں چائے پانی بھی ہوگی۔"

بولے۔ "وہ تو ہوگی ہی، کچھ اور بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "جو ارشاد ہو۔"

نظام صاحب نے کہا۔ "گانا بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "گانا بھی ہو جائے گا۔ مگر اس گانے کو سمجھے گا کون؟ میرے ہاں تو صرف پکّا گانا ہوتا ہے۔"

نفاست صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔ "گانا ہونا چاہیے۔ پکّا ہو یا کچّا۔ اور یہاں آپ کا گانا ہم ضرور سنیں گے۔" سب نے ہاں میں ہاں ملائی، اور مجھے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

دعوت والے دن میں نے استاد رمضان خان اور امام الدین کو بلا لیا۔ کھانے سے فارغ

qasarulkutub.blogspot.com

ہونے کے بعد رمضان خاں صاحب نے تان پورہ سُر کرنا شروع کیا۔ کوئی دس منٹ اِس میں لگ گئے۔ احباب کسمسانے لگے۔ مجھے کِنگ جارج کے دِلّی دربار کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ مَیں نے احباب کی کوفت دُور کرنے کے لیے سُنایا کہ بادشاہ کے پروگرام میں دِل بستگی کے لیے طرح طرح کے فنون کی نمائش بھی رکھی گئی تھی مثلاً ایک رات کو آتش بازی چھوڑی گئی۔ دِلّی کے آتش بازوں نے بڑے بڑے کمالات دکھانے تھے۔ مَیں اُس وقت پانچ چھ سال کا تھا مگر اب تک یاد ہے کہ دھماکے کے ساتھ ایک گولا اُوپر کو چلا اور آسمان پر جا کر پھٹا تو کِنگ جارج اور کوئین میری کی تصویر بن گئی۔ خیر پندرہ منٹ اِس کے بھی رکھے گئے کہ بادشاہ کو یہاں کا گانا سُنوایا جائے گا۔ ریاستوں سے بڑے بڑے خان صاحب آئے ہوئے تھے۔ اُن میں سے دو کو انتخاب کر کے وقت مقررہ پر بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ طنبوروں پر سے مخملیں غلاف اتارے گئے۔ سارنگی نواز نے سارنگی کو سُر دکھایا اور طربیں ملانے لگے۔ خان صاحبوں نے کھونٹیاں مروڑ مروڑ کر تار ملانے شروع کیے پھر منکوں سے ملانے لگے۔ ادھر طبلہ نواز نے ہتھوڑی لے کر آٹھوں گھاٹ صحیح کرنے شروع کیے۔ اِدھر ساز سُر میں ہُوئے اُدھر پندرہ منٹ ختم ہو گئے۔ بادشاہ سلامت نے ہندوستانی موسیقی کا جو مظاہرہ آج دیکھا تھا، اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اور دربار برخاست ہو گیا۔ اس لطیفے پر سب ہنسنے لگے۔ استاد بھی کھسیانی ہنسی ہنسے اور بولے "میاں تانپورے کے ملانے ہی سے گویّے کی جانچ ہو جاتی ہے۔" تانپورہ مل گیا تو طبلے کی ٹھکائی ہونے لگی۔ مگر لطیفہ اپنا کام کر گیا۔ اس لیے طبلے کے ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میاں امام الدین نے باجا سنبھالا اور خان صاحب نے مالکونس کا خیال اکواڑی میں شروع کر دیا۔ استاد رمضان خان تھرکھنڈ کی گائیکی پر حاوی ہیں۔ انھوں نے جو سُروں کے مجموعے بنانے شروع کیے تو آدھا گھنٹہ ٹیپ تک پہنچنے میں لگا دیا۔ اس کے بعد تان پلٹوں کا سلسلہ جو شروع کیا تو سُروں کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔

خدا خدا کر کے ۵۴ منٹ میں خیال ختم ہُوا تو سامعین کی جان میں جان آئی۔

سب نے بہت تعریف کی۔ نفاست صاحب نے کہا۔ "استاد آپ نے تو کمال کر دیا۔" پھر فوراً ہی مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "اب آپ سُنائیے۔ استاد تھک گئے ہوں گے، انھیں آرام کرنے دیجیے۔" اُستاد چمک کر بولے۔ "تھک گئے۔ توبہ توبہ کر کے کہتا ہوں،

ابھی تو پانچ گھنٹے اور گا سکتا ہوں۔" یہ سُن کر سب کے چہرے فق ہو گئے۔ ایک ہی خیال نے اُن کا پلیتھن نکال دیا تھا۔ بڑی بے کسی سے میری طرف دیکھا اور معاً مجھے وہ گائے یاد آگئی جو بقر عید پر نفاست صاحب کے گھر کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور قصاب اُس کی رسّی کھول رہا تھا۔

مجھے اُن پر بڑا ترس آیا۔ مَیں نے کہا۔ "یہ گانا حظِ نفس کے لیے نہیں ہوتا، تزکیۂ قلب کے لیے ہوتا ہے۔" آوازیں آئیں۔ "بے شک، بے شک!" مَیں نے کہا۔ "دیکھیے، مَیں آپ کو درباری کا خیال سُناتا ہوں۔" سب کے چہرے پھر اُتر گئے۔ مَیں انھیں بطورِ سزا گانا سُنانا چاہتا تھا۔ انھیں بتا دیا گیا تھا کہ پکّا گانا ایک بہت بڑی مصیبت ہے، مگر وہ نہ ملنے اور یہی کہتے رہے کہ ہم تو پکّا گانا ہی پسند کرتے ہیں۔

"لو! تو پھر سُنو!" مَیں نے درباری کا خیال آدھے گھنٹے میں ختم کیا۔ گانے کے دوران میں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نہ آہ نہ واہ۔ قبرستان کا منظر پیشِ نظر تھا۔ جب مَیں نے دیکھ لیا کہ ان کا اچھی طرح تزکیۂ نفس ہو گیا تو خیال ختم کیا اور فوراً کافی منگوا کر سب کو پلوائی۔ ضرب بڑی کاری لگی تھی۔ اسے سہلانا بھی ضرور تھا۔ اس لیے اپنے بعد میاں امام الدین کو بٹھایا انھوں نے فانی، جگر اور فیض کی غزلیں سُنا کر محظوظ کیا۔ اور سب ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔

اگلی دعوت نظام صاحب کے ہاں ہُوئی۔ انھوں نے ایک بالکل نئے انداز کا انتظام کیا تھا۔ یعنی وہ کھانے جو میمن لوگ کھاتے ہیں، انھی کے ایک باورچی سے تیار کرائے تھے کھانا سب کھاتے جاتے تھے اور خوش گپیاں ہوتی جاتی تھیں۔ نفاست صاحب نے پکّے گانے کا ذکر چھیڑا اور ہنس کر کہنے لگے۔ "ہو گا میاں کوئی بڑا اُونچا فن۔ اپنے پلّے تو کچھ نہیں پڑا۔ اگر ایسا ہی گانا سُننا ہو تو کیسی گُنّے کے ڈھیلا کیوں نہ مار دیا جائے۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ نظام صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "فن تو یقیناً یہ ہے اور بہت اونچا فن ہے، یہ کہیے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔" نفاست صاحب بولے۔ "یہ بھی کوئی فن ہُوا کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔" مَیں نے کہا۔ "آپ تجریدی آرٹ کی تصویروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں؟" بولے۔ "نہیں صاحب۔ عجیب بھدّے بھدّے رنگ لگا کر کہتے ہیں کہ یہ شاہکار ہے۔ ایک لطیفہ سُنا تھا کہ کسی ایسے ہی تجریدی آرٹ کے

qasrulkutub.blogspot.com

شاعر کا کلام جیسے کسی اناڑی نے پوچھا تھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اُسے بتایا گیا کہ "یہ چراگاہ میں گائے چر رہی ہے"۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا کہ سبزہ کہاں ہے، اور گائے کہاں ہے؟ کہا گیا کہ گھاس گائے نے چر لی ہے۔ اور گائے؟۔ چرنے کے بعد چلی گئی"۔ ابھی حال میں ایک خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ کسی نمائش میں ایک تصویر کو پہلا انعام ملا۔ بعد میں مصوّر نے بتایا کہ غلطی سے تصویر اُلٹی لگا دی گئی تھی۔ ان لطیفوں پر جب سب ہنس چکے تو میں نے عرض کیا۔ فنونِ لطیفہ کو سمجھنے کے لیے اپنے اندر بھی بُدھی ہونی چاہیئے۔ پکّا گانا یا تجریدی آرٹ فن کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ فن کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے برسوں مطالعہ و مشاہدہ اور ریاض کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے سولہ سال انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ اس پر بھی شیکسپیئر اور ملٹن سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔"

نفاست صاحب بولے۔ "ہاں! یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتایئے آپ نے موسیقی یا مصوّری کتنے سال تک سیکھی؟" بولے۔ "بالکل نہیں سیکھی۔" میں نے کہا۔ "تو پھر آپ اسے کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ جبھی تو میں نے کہا تھا کہ پکّا گانا ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔" "عذاب ہے صاحب۔" نفاست صاحب سنجیدگی سے بولے اور سب ہنس پڑے۔

"اب کھائی سو کھائی، اب کھاؤں تو رام دُہائی۔ آپ نے اس دن ہمارا پورا تزکیۂ نفس کر دیا۔ اب آپ کی طرح ہم بھی ۳۰-۳۵ سال اس فن کو سیکھیں، سُنیں اور پرکھیں تو اس سے لُطف اندوز ہوں۔ نا بابا نا۔ آپ ہی کو مبارک رہے یہ فن۔" غرض بڑی دلچسپ گفتگو رہی کھانے کے بعد، اور اگلی دعوت نفاست صاحب کے ہاں طے ہوئی۔

نفاست صاحب کو اللہ نے پیسہ دیا تھا اور پیسہ کے ساتھ دل بھی دیا تھا۔ وہ محنت کر کے خوب کماتے تھے۔ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے، آرام سے رہتے۔ دوستوں کی خاطر تواضع پر جی کھول کر صرف کرتے۔ اپنی دعوت سے دو ایک دن پہلے اپنے گھر کے آگے بیٹھے ہوئے مل گئے تھے، فرمانے لگے۔ "کھانے کے بعد کچھ ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "جیسی رائے ہو۔" ہنس کر بولے۔ "پکّے گانے سے تو آپ نے توبہ کرا لی۔ آپ کے تو سیکڑوں شاعر دوست ہوں گے۔ کسی اچھے سے شاعر کو پکڑ لایئے۔" نفاست صاحب کو میری اس کمزوری کا علم تھا کہ میں شاعروں کے نام سے بھڑکتا ہوں۔

اور ہنس ہنس کر میرا یہ فقرہ دہرایا کرتے تھے کہ "میں نے تو شاعروں کے ڈر کے مارے اپنے گھر پر اپنے نام کی تختی بھی نہیں لگائی۔" اس پر بھی انھوں نے مجھ سے ایک شاعر کو "پکڑ لانے" کی فرمائش کر دی۔

میں نے کہا۔ "ہم کھانے کے بعد کوئی اور بُرا کام نہیں کر سکتے۔" بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور بولے۔ "آپ کا بھی تو تزکیۂ نفس ہونا چاہیئے۔"

دعوت ہوئی اور بڑے ٹھاٹھ کی ہوئی۔ میں اپنے ساتھ حضرت ظریف دہلوی کو لے گیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، اور چائے کے ساتھ ظریف صاحب کا چٹ پٹا کلام۔ ظریف صاحب مسخرے پن کے شعر بھی کہتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کو نمبروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے نمبر کی شاعری پرانی کا سنجیدہ کلام ہے۔ دُوسرے نمبر میں مزاحیہ، تیسرے میں طنزیہ اور چوتھے نمبر پر فحش۔ ظریف صاحب کا تعارف کراتے ہوئے میں نے ان کی نمبروار شاعری کا تعارف بھی کرا دیا۔ حاضرین اُن کا کلام خصوصاً نمبر ۴ سُننے کے لیے ہمہ تن گوش بن گئے، مگر ایک دم سے نمبر چار کی فرمائش بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا نمبروار ان کا کلام سنتے چلے گئے۔ جب نمبر چار کی باری آئی تو ظریف صاحب نہ نکّر کرنے لگے۔ ان کی عمر ستّر سے اُوپر ہے۔ ویسے وہ بڑے مُنہ پھٹ ہیں، مگر اجنبی لوگوں میں پھر بھی لحاظ مانع ہوتا ہے۔ جب چاروں طرف سے بہت اصرار ہوا تو انھوں نے گونگے کا ایک قطعہ سُنایا۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے کیوں کہ ظریف صاحب جب اپنا کلام سُناتے ہیں تو خود بھی کلام کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھلا انھیں کون چھوڑتا تھا۔ تابڑ توڑ فرمائشیں ہونے لگیں۔ پھر ظریف صاحب نے تکلّف بالائے طاق رکھ کر جو اپنی منظومات سُنانی شروع کیں تو اللہ دے اور بندہ لے۔ مادر پدر آزاد شاعری نے چھت اُٹھا دی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک ان کا کلام سُنا اور اشتیاق پھر بھی باقی رہ گیا۔ یہ بھی ایک یادگار دعوت تھی، جس کا چرچا مہینوں رہا۔[1]

نفاست صاحب دل کے مریض تھے مگر بڑے زندہ دل اور وسیع القلب انسان

---

[1] ظریف دہلوی کا انتقال ۷ جنوری ۱۹۶۵ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔

qasarulkutub.blogspot.com

تھے۔ دُوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔ انگریزی اور اُردو کی کتابیں چھاپتے تھے اور ان کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ میں نے چونکہ خود پبلشنگ کا کام کیا ہے، اس لیے میرا تعلق بیسیوں پبلشروں سے رہا ہے۔ میں نے تو کوئی پبلشر ایسا نہیں دیکھا، اِلّا ماشاءاللہ جو ادیبوں کا شکار نہ کرتا ہو۔ یہاں تو میں نے ایسے ایسے پبلشر دیکھے ہیں کہ میں نے متنفر ہو کر پبلشنگ کا کام ہی چھوڑ دیا ہے تاکہ میں اُن کی برادری سے از خود خارج ہو جاؤں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ غضب خدا کا مصنف سے اس کا مسوّدہ بھی لے لیا اور کتاب کی لاگت بھی، اور اس کے بعد سارا اسٹاک کھا کر ڈکار تک نہ لی۔ بچارا مصنف ہے کہ جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے اور کسی کو اُس پر ترس نہیں آتا۔

نفاست حسین اس کلیہ سے استثنا تھے۔ میں نے ان کی ادب دوستی کی کئی مثالیں دیکھیں۔ سب سے بڑی مثال تو ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۸ سال انگریزی پڑھانے کے بعد ترکِ وطن کر کے پاکستان آ گئے تھے اور کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ انگریزی ہو گئے تھے۔ تھوڑی ہی مدّت کے بعد وہ ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گئے، اور یونیورسٹی سے انھیں علیحدہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بے چارے سیدھے سے آدمی ہیں، چھل فریب وہ کیا جانیں، انھوں نے سوچا۔ "مُلکِ خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست"۔ کسی اور یونیورسٹی میں جگہ مل جائے گی۔ کچھ دنوں بعد پشاور یونیورسٹی میں ایک جگہ نکلی، درخواست دی، انٹرویو کے لیے بُلائے گئے۔ نہایت موزوں اُستاد سمجھے گئے، مگر جگہ نہ ملی۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ کراچی یونیورسٹی والوں نے اُن کی بُرائی لکھ بھیجی تھی۔ اب انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں دُوسری یونیورسٹیوں میں بھی یہی معاملہ پیش نہ آئے۔ ان کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی سے بھی جواب مل گیا۔ سخت حیران اور پریشان ہوئے۔ پورا ٹبّر ساتھ، سات آٹھ سو مہینے کا خرچ۔ ایک مقامی کالج کے مالک نے انھیں زیادہ تنخواہ دے کر پرنسپل رکھنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وضع دار آدمی تھے، اُنھوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔ یونیورسٹی کے بعد کالج میں آنا انھیں گوارا نہ ہوا۔

— مگر مارنے والے سے جلانے والا قوی تر ہے۔ اس بے کاری و پریشانی کے زمانے میں

انھیں کتابیں لکھنے کا خیال آیا۔ دو ایک ناول اُدھورے پڑے تھے، انھیں مکمل کیا۔ اپنے مضامین کے مجموعے مکمل کیے۔ پبلشروں کے چکّر کاٹے۔ اونے پونے ان کا سودا کیا۔ شدہ شدہ ٹیک کارپوریشن میں بھی پہنچ گئے۔ وہاں نفاست صاحب اور نظام صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے نام اور کام سے کون واقف نہیں؟ ان حضرات نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جو کتابیں تیار تھیں، ان سے لے لیں اور نقد معاوضہ پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ ان کا تجربہ تو اب تک یہ تھا کہ جب تک پھیرے کرتے کرتے جوتیاں نہ ٹوٹ جائیں، پبلشر پیسے نہیں دیتا، بلکہ پورے پیسے پھر بھی نہیں دیتا۔ لہٰذا ان دونوں بھلے آدمیوں سے ڈاکٹر صاحب کی دوستی ہو گئی۔ اس تعلّق سے ڈاکٹر صاحب کی مالی پریشانی رفع ہو گئی۔ ٹیک کارپوریشن کے لیے انگریزی میں وہ تعلیمی کتب اور نصابی کتب کے نوٹس لکھتے رہے۔ اُن کے نام کا کھاتہ کھُل گیا۔ اور حسبِ ضرورت اخراجات کے لیے ٹیک کارپوریشن سے روپیہ لیتے رہے۔ ڈھائی تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کی تھوپی ہوئی بدنامی کے داغ کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے، مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ یونیورسٹی بھلا اپنے فیصلے کو واپس کیسے لیتی۔ اس کے پرسٹیج کا سوال تھا۔ بڑی بڑی کوششیں کی گئیں، ناکامی ہوئی۔ ادیبوں کا ایک ڈیپوٹیشن بھی وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں باور کرایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ قصور ہے تو انھیں معاف کر دیجیے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔ "خدا بھی قصور معاف کر دیتا ہے۔" بڑی رعونت سے جواب دیا۔ "جی ہاں، خدا معاف کر دیتا ہے۔" ہم بیزار ہو کر وہاں سے چلے آئے مگر ڈاکٹر صاحب کے دل کو لگی رہی۔ اور ایک دن ڈاکٹر صاحب بڑے خوش خوش آئے اور کہا کہ داغِ بدنامی مِٹ گیا ہے، مگر میں اب کراچی یونیورسٹی میں نہیں جاؤں گا، سندھ یونیورسٹی میں جا رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ کسی ذریعہ سے بات گورنر تک پہنچائی گئی اور انھوں نے کیس دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے کی اِس لیے ضرورت پڑی کہ ڈاکٹر صاحب کی صحیح

qasarulkutub.blogspot.com

پریشانی کا اندازہ ہو جائے۔ حد ہے اندھیر نگری کی کہ ایک شخص پر چاروں طرف سے روزی کے دروازے بند کر دیے گئے مگر ظالم بندے یہ بھول گئے کہ رزّاق کوئی اور ہے۔ ع :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

ڈاکٹر صاحب کو یونی ورسٹی سے سات سو ملتے تھے، یونی ورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد نفاست و نظام کے ہاں ہزار بارہ سو ملنے لگے۔ میں جانتا ہوں کہ بے روزگاری کے تھوڑے سے عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب پر کیا گزر گئی۔ اُن کی بھوک اور نیند اُڑ گئی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح دھوپوں میں پھرتے رہتے تھے۔ یہی کے سب ساتھی ہیں مگر ان کا کوئی نہیں۔ مگر زمانہ بھلے آدمیوں سے خالی نہیں رہتا۔ نفاست حسین ہنس ہنس کر کہا کرتے تھے۔ "ہم نے ڈاکٹر صاحب پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہمیں کتابیں لکھ لکھ کر دیتے ہیں یہ ان کا احسان ہے۔" یہ اُن کی نیک نیتی تھی کہ ان کا کاروبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور روپے کی لہر بہر ہو گئی۔

نفاست حسین نے تعلیمی کتب کے ساتھ ساتھ ادبی کتب بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لاہور بھی گئے تھے، اور وہاں سے اچھے اچھے ادیبوں کے مسودے خرید کر لائے تھے۔ بزرگ ادیب حضرت ایم اسلم سے پانچ ناولوں کے مسودے لائے تھے۔ غالباً دو شائع بھی کر دیے تھے۔ مگر اسلم صاحب نے بتایا کہ رقم پانچوں کی ادا کر دی تھی۔ ایسے کھرے پبلشر اگر چند اور ہو جائیں تو ادب اور ادیبوں کے دن پھر جائیں۔

نفاست حسین کو اللہ نے روپیہ دیا مگر روپیہ کے ساتھ جو خرابیاں آتی ہیں، ان سے وہ بچے رہے۔ سارا دن اپنے کام میں لگے رہتے اور بعد مغرب اپنے گھر آجاتے۔ نہ سنیما نہ کلب نہ ہوٹل، کچھ نہیں۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔ اپنے بچوں اور محلّے کے دوستوں سے جی بہلاتے تھے۔ کھلانے پلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ پیغام چلا آرہا ہے کہ ایک آئس کریم بنانے والا آگیا ہے۔ کل شام کو ذرا اس کا ٹیسٹ لیا جائے۔ دس بارہ دوست جمع ہیں اور آئس کریم کا دور چل رہا ہے۔ ایک دن سرِ راہ مل گئے۔ پوچھا "آپ کو سیخ کباب پسند ہیں؟" جواب کا انتظار کیے بغیر بولے۔ "لاجواب بناتا ہے، ہم کھلوائیں گے آپ کو پرسوں۔" پرسوں گئے تو دیکھا صحن میں کبابی بیٹھا سیخیں بھر رہا ہے۔ نفاست صاحب

نے پوچھا "کیوں بھئی کیا دیر ہے؟" جواب ملا۔ "تیار ہیں۔" ہم میز پر پہنچے اور کباب آنے شروع ہو گئے۔ پیاز کا لچھا، ٹماٹر کے قتلے، لیموں طشتریوں میں پہلے ہی رکھا ہوا تھا۔ گرم گرم گولے کے کباب آتے رہے اور رُکھے کھلائے جاتے رہے۔ چٹ پٹے، مزے دار اور سیروں سے کھائے گئے مرچیں کم ہونے پر بھی کچھ تو تھیں ہی، برف کے پانی سے انھیں کم کیا۔ اتنے میں سب کے سامنے گاجر کا حلوہ آگیا۔ یار لوگوں نے کہا۔ "پہلے سے کیوں نہ بتایا کہ اس کے لیے گنجائش رکھی جاتی۔" صاحبِ خانہ نے ہنس کر کہا۔ "یہ اپنی جگہ خود بنا لے گا۔" چلیے صاحب، منہ بھی میٹھا ہو گیا۔ مگر نہیں، ابھی نہیں۔ اب چل کر دیوان خانہ میں بیٹھیے، چائے کی ایک ایک پیالی پیجیے، پان کی گلوری منہ میں رکھیے۔ سگریٹ پیجیے اور گپ لڑائیے۔ ملک، حکومت، محلّے کی سیاست پر گفتگو کیجیے۔ جب اس سے جی بھر جائے تو اپنے گھر سدھاریے۔

ایک دن پیغام پہنچا کہ بمبئی کا ایک گانے والا آیا ہے۔ رات کا کھانا یہیں کھائیے اور گانا سُنیے۔ بمبئی کا گانے والا۔ اور نفاست صاحب کے ہاں! یہ کیا معمّا ہے۔ رات کو پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب خالص میراثی وضع میں کفنائے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں دیکھا۔ ارے اسے تو میں نے کہیں دیکھا ہے! وہ بھی کوئی آدھے منٹ تک مجھے دیکھتا رہا اس کے بعد "ارے شاہد صاحب" کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اب حیران ہونے کی باری نفاست صاحب کی تھی۔ جب ہم بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔ "زہے نصیب، یہ صورت پندرہ سال بعد دوبارہ دیکھی۔ مگر میاں آپ یہاں کہاں؟" میں نے کہا۔ "میں یہیں رہتا ہوں، نفاست صاحب کا پڑوسی ہوں۔" دراصل یہ بے چارہ ایک معمولی سا آرٹسٹ تھا جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے غزل گیت گایا کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں کراچی آگیا مگر یہاں اس وقت ریڈیو اسٹیشن نہیں تھا۔ اس لیے بمبئی چلا گیا۔ وہاں اس نے اچھے پیسے کمائے اور فلموں میں اپنی جگہ بنالی۔ یہاں اپنی لڑکی سے ملنے آیا تھا تو اتفاق سے نفاست صاحب کے ہتھے چڑھ گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جو اس سے گانے کو کہا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "نا، بابا، نا۔ میں بھلا ان کے سامنے کیا گا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ شوق سے گائیے۔ آپ کو سنے ہوئے پندرہ سال ہو گئے۔" تو اس نے بڑے ادب لحاظ سے چند غزلیں اور گیت سنائے۔ اس کے

qasarulkutub.blogspot.com

بعد معلوم ہوا کہ وہاں بہت اچھے حالات ہیں۔ یہ تو اس کے ہاتھوں کی انگوٹھیوں سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ یہاں کا حال پوچھا۔ مَیں نے دبی زبان سے کہا۔ "اچھا ہے۔" مَیں اسے کیا بتاتا کہ اُستاد رمضان خاں بینائی کھو کر لاولدیت میں بھوکا مر رہا ہے۔ "اپنا گھٹنا کھولو اور آپ ہی لاجوں مرو۔"

محرّم میں نفاست صاحب کے ہاں ایک دن حلیم ضرور کھائی جاتی تھی۔ وہ اس کا خاص اہتمام کرتے تھے اور کئی دیگیں پکوا کر تقسیم بھی کرتے تھے۔

نفاست صاحب ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ مگر دل کی بیماری انھیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ انھیں دَورے پڑنے لگے تھے۔ پہلے طویل وقفوں سے، پھر قلیل وقفوں سے۔ ایسا بھی ہوا کہ شدید دَورہ پڑا تو ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں سے چند روز بعد ساونٹے ہو کر آ گئے۔ اب جو اُن پر دَورہ پڑا، ہم سمجھے کہ کوئی بات نہیں، اچھے ہو جائیں گے۔ مگر ایک دن صبح ہی صبح سُنا کہ نفاست حسین کا انتقال ہو گیا۔ بھاگا ہوا ان کے گھر گیا تو رونے پیٹنے کی دردناک آوازیں سُنائی دیں۔ معلوم ہُوا کہ صبح اسپتال میں جان دے دی۔ دو گھنٹے بعد پھر گیا تو اُن کی میّت کو غسل دیا جا رہا تھا۔ نفاست حسین تختے پر لیٹے ہُوئے تھے۔ ان پر پانی کے تریڑے پڑ رہے تھے۔ مگر وہ بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے۔ بیماری یا موت نے ان کے جسم اور چہرے پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی آنکھیں نیم باز تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم،
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

(۱۹۶۵ء)

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب سے پچیس تیس سال پہلے دِلّی میں مَیں نے جن بزرگوں کو دیکھا اور اُن سے قریب ہونے کا بھی مجھے موقع ملا، اُن میں سے بیشتر تو اللہ کو پیارے ہو گئے، باقی جو ہیں (اللہ انھیں ہزاری عمر دے) وہ چراغِ سحری ہیں۔ اُن بزرگوں کے دم سے دِلّی کچھ نہ رہ جانے پر بھی دِلّی ہی تھی۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ ان کے دم قدم سے اگلی وضعداریاں قائم تھیں۔ دلّی کی تہذیب زندہ تھی۔ دِلّی کی زبان ہانکے پکارے کہہ رہی تھی کہ "میری گُل افشانی اب دیکھ لو، پھر تمھاری آنکھیں ڈھونڈا ہی کریں گی۔ میری البیلی من موہنی باتیں اب سُن لو، ورنہ کان ترستے ہی رہیں گے۔ میرے جادو کا اثر محسوس کر لو۔ بعد میں تمھارا دِل پھڑکتا ہی رہ جائے گا۔"

وہ شکلیں ایک ایک کر کے مِٹ گئیں۔ اُن کی یاد بھی اب دُھندلی پڑ گئی۔ اُن کے نورانی چہرے ماضی کے دُھندلکوں میں چمکتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر اُن کے نقوش مدھم اور ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ مَیں یاد کا چراغ جلا کر ان مقدس شکلوں کو دیکھتا ہوں تو خواب کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ خواب، یہ سائے بھی نہ مِٹ جائیں، کہیں عہدِ رفتہ کی بھول بھلیوں میں نہ کھو جائیں۔ اس لیے اُن کے دُھندلے نقوش "نذرِ نقوش" کرتا ہوں۔ یہ طاقِ نسیاں کے چند مِٹے مِٹے سے نقش و نگار ہیں۔ کاش کوئی انھیں اُجاگر کر دے! (شاہد احمد دہلوی)

میر باقر علی داستان گو

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دِلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی

qasarullututub.blogspot.com

تھے جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہوئے۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ سفید چھوٹی سی ڈاڑھی سر پر دوپلی، پاؤں میں دیسی جوتی، انگرکھا اور چُست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستّر کے درمیان۔ کھلتا ہُوا رنگ، ستواں ناک، میانہ قد، باتیں کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے۔ داستان سُنانے دُور دُور جاتے تھے۔ رئیسوں اور نوابوں میں بلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سُنانے کے لیے ملازم بھی رہے۔ رئیس مر گیا تو دِلّی واپس آگئے۔ اِملی کی پہاڑی پہ گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ زمانہ ایسا پلٹا کہ میر صاحب کی پرسش ختم ہوگئی۔ دلّی کے ہندو رئیس چُھنّا مل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پہ ملازم تھے۔ چُھنّا مل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سُن رہے ہیں۔ پچیس سال ہو گئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانے میں داستان سُنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دِن مقرر تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حِصّہ سُنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ میر صاحب ہمیشہ داستانِ امیر حمزہ ہی سُنایا کرتے تھے۔ ایک نے اُن سے پوچھا کہ میر صاحب! یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے "عمر بھر میں ایک دفعہ۔"

میر صاحب کے آبا و اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً انھی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سُنایا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صِرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اُٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اُٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور اُس نے تنگ آکر کہا "آج پردہ اُٹھ جانا چاہیے۔" تب کہیں وہ پردہ اُٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ ملتا جلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں۔ زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں نام گِن جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے۔ درمیانہ طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں، بھٹیاریاں، سقنیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پُورا نقشہ کھنچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجہ سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیّاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سو ڈیڑھ سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صِرف طوطے کی طرح رَٹے ہُوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں، ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑتے نہ تھے بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ مثلاً منجنیق کو بیان کرنے ہی میں پندرہ منٹ صَرف کر دیے۔ عورت کا حُسن بیان کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ اور کچھ نہیں تو چال ہی کی سیکڑوں قسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کر ایک کمرے سے دُوسرے کمرے میں آ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہوگیا، بیگم دہلیز نہیں پھلانگتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اُپرانے یا اُکتانے لگیں۔ انھوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔ ہر علم کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اُستادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ اور تو اور جب دِلّی میں طبیہ کالج کُھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی اُجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔ اس پہ قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حُقّے کا دَور چلتا رہتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔ اسے رُوئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر انٹے کو اس میں گھوستے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون حل ہو کر پانی میں آجاتی تو رُوئی اُگال دان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چُسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ فرماتے "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو۔" پھر داستان شروع کر دیتے۔

qasrulkutub.blogspot.com

دلّی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے پھر ایک دور ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر پر داستان کہنی شروع کر دی۔ اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔ دس بیس شائقین آ جاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا۔ بعض دفعہ سامعین کی حسبِ فرمائش کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے۔ اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ کا نقشہ آ جاتا۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو عیّاریاں بیان ہو جائیں۔ اور میر صاحب عیّاروں کے کارنامے بیان کرنے لگتے۔ میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ ایک دن ہم بھی سننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو کے آگے کتاب کھلی دھری ہے۔ اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور بہت جوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اونچا کر لیتے ہیں۔ طبیعت بڑی مکدّر ہوئی۔ جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی یہاں آ جاتے تو کلکتہ والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کسے کہتے ہیں۔ نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کولوٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔ قصّہ مختصر، میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا:

"حضور یہ اعجاز ہے۔ حضور یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔"

جب داستان سننے والوں کا قحط ہو گیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں۔ مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ "گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی"، "پاجی پڑوس"، "مولابخش ہاتھی" اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں۔ جو ایک بار چھپنے کے بعد پھر نہیں چھپیں۔ اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ مگر جو لطف ان کی تقریر میں تھا، تحریر میں نہ آ سکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر پیرا کے شاگرد تھے۔ جن بزرگوں نے میر پیرا کی داستانیں سنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ غالبؔ فرق یہی ہو گا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کس مپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دلّی کا کامل الفن آخری داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لیے چھالیا بیچتا تھا۔ ؏

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

میر جالبؔ دہلوی

میر جالبؔ دہلوی میر باقر علی کے ایک عزیز دوست تھے۔ قد و قامت میں انھی جیسے۔ صورت و شکل اور وضع قطع میں بھی ان سے مشابہ۔ اتنا بڑا صحافی اردو صحافت نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ کتابیں پڑھنے کا انھیں بچپن سے شوق تھا۔ جو کتاب، رسالہ، اخبار ہاتھ لگ جاتا، اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتے۔ اخباروں کے اشتہار تک نہیں چھوڑتے تھے۔ بازار میں کوئی چھپا ہوا کاغذ پڑا مل جاتا تو اسے اٹھا لاتے اور گھر آ کر اسے پڑھتے۔ غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کی تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لیے بچوں کو پڑھاتے۔ اس زمانے میں سستے ناولوں کے ترجموں کی مانگ تھی۔ میر صاحب نے اس کام کی طرف بھی توجہ دی۔ مولوی عنایت اللہ اور قاری سرفراز حسین سے مشورہ اور اصلاح لینے لگے۔ یوں ترجمہ کرنے کی بھی انھیں اچھی مشق ہو گئی۔ اب انھیں اخبار نویسی کی چیٹک لگی۔ دلّی میں اس وقت کوئی قابلِ ذکر اخبار نہیں تھا۔ اس لیے میر صاحب لاہور پہنچے اور ایک اخبار میں تیس روپے پر ملازم ہو گئے۔ اس تیس روپے سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی اور مرتے دم تک وہ ترقی ہی کرتے چلے گئے۔ انتخاب لاجواب، پیسہ اخبار اور وکیل کی ادارت نے ان کی منفرد حیثیت قائم کر دی۔ جب مولانا محمد علی نے دلّی سے ہمدرد جاری کیا تو میر صاحب کو اپنے اخبار میں بلا لیا۔ میر صاحب مشین کے کاٹے سے لے کر چھپے ہوئے پرچے کی تقسیم تک ہر کام سے واقف تھے۔ ایسا کام سنبھالا کہ مولوی محمد علی بالکل بے فکر ہو گئے۔ ہمدرد کے بند ہونے پر میر جالبؔ کلکتہ چلے گئے۔ جب لکھنؤ سے راجہ صاحب محمود آباد نے ہمدم نکالا تو اس کی ادارت کے لیے راجہ صاحب کی نظرِ انتخاب میر صاحب ہی پر پڑی۔ ہمدم کے بعد میر صاحب نے اپنا اخبار ہمت جاری کیا جو ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوا۔ میر صاحب چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ہر چیز کے متعلق ان کی معلومات اتنی زیادہ تھیں کہ اس پر اگر

dasarulkutub.blogspot.com

کوئی ان کی تقریریں سُن لے تو چھوٹی موٹی کتاب تیار کر لے۔ لوگ اُن سے کوئی سوال پوچھ کر گنہگار ہو جاتے تھے میر صاحب کا لیکچر شروع ہونے کے بعد ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ میر صاحب بہت باقاعدہ آدمی تھے۔ ردّی سے ردّی اخبار کو بھی پڑھتے تھے اور اس کا فائل بنا لیتے تھے۔ جتنے خط ان کے پاس آتے تھے سب کو محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے کتب خانہ میں کئی ہزار نایاب کتابیں تھیں۔ افسوس کہ میر صاحب کے انتقال کے بعد ان کا سارا بیش قیمت سرمایہ یا تو دیمک نے کھا لیا یا چُولھے میں جھونک دیا گیا۔ غالباً پانچ ہزار کتابیں ان کے پوتے جمیل جالبی نے جامعہ ملّیہ دہلی کو دے دی تھیں وہ اگر محفوظ ہوں تو ہوں، باقی سب کچھ خاک میں مل گیا۔ میر باقر علی سے مجھے بہ لحاظ علم اور بہ لحاظ افیون تعلق خاطر تھا۔ اور ہاں حُقّہ باز بھی دونوں تھے۔

شمس العلماء مولوی عبد الرحمٰن

مولوی صاحب مشن کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، مگر بڑے لدھڑ اور سُست آدمی تھے۔ مگر کبھی نام و نمود کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ بہت کچھ لکھ سکتے تھے مگر کچھ نہ لکھا۔ نہ جانے "مراۃ الشعر" بھی کیسے لکھ گئے۔ کالج میں یہ "بڑے مولی ساب" کہلاتے تھے۔ ان کی سنجیدگی، بردباری اور اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے عیسائی پرنسپل تک ان کا احترام کرتا تھا۔

میں نے جب انگریزی ادب میں بی اے کیا تو خیال ہوا کہ اب فارسی ادب میں ایم اے کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی تھے جو ڈاکٹریٹ کے لیے ولایت گئے ہوئے تھے۔ کالج میں ایک نئے پروفیسر آگرہ سے آئے تھے۔ انھوں نے نظامی پڑھانا شروع کیا۔ وہاں بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ چھوٹتے ہی عربی کا شعر آ گیا۔ پوچھنے لگے "مولانا آپ کو عربی آتی ہے؟" میں نے کہا۔ "نہیں۔" بولے۔ "مجھے بھی نہیں آتی۔ آپ عربی کے شعر بڑے مولوی صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی قصائد قاآنی پڑھانے بیٹھے۔ ان سے اشعار کے معنوں میں اختلاف ہوا تو بولے۔ "ہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بہتر معنی یہی ہیں۔ آپ تو خود اچھی فارسی جانتے ہیں۔ کوئی شعر دشوار معلوم ہو تو پوچھ لیا کیجیے۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے

دوبارہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔ فارسی والے مولوی صاحب نے کچھ دن تو کام چلایا، پھر وہ کالج چھوڑ کر چلے گئے۔ بڑے مولوی صاحب سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لڑکے ان کے رُعب میں ہی مرے جاتے تھے۔ میں بھی کچھ تنگ ہی آ گیا تھا۔ جان پر کھیل کر مولوی صاحب سے اسٹاف رُوم میں ملا، اور انھیں بتایا کہ کوئی پڑھانے والا نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ "آپ میرے گھر آ جایا کیجیے مگر بہت سویرے آنا پڑے گا، صبح کی نماز کے فوراً بعد۔" میں نے بہ جبر اسے منظور کیا اور مولانا کے گھر سورج نکلتے ہی پہنچ جاتا۔ مولانا نے چند مہینے میں "وقائع نعمت خانِ عالی" اور "اخلاقِ جلالی" دو کتابیں پڑھائیں۔ دُوسری کتاب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رمضان شریف آ گئے۔ مولانا روزے رکھتے تھے۔ میں اب گویا ان کے آرام میں مخل ہونے لگا۔ وہ سر سے پاؤں تک کمبل تانے پلنگ پر پڑے رہتے اور میں بہ آوازِ بلند پڑھتا رہتا۔ جہاں اٹکتا وہ فرفر آگے بڑھ جاتے۔ ایک دِن پہنچا تو ایک اور شان دار بزرگ اُن کے پاس بیٹھے دکھائی دیے۔ بڑی بے تکلف اور مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی پھبتی رہے تھے کہ تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے اور مولوی صاحب انھیں بہ لطائف الحیل ٹال رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ مُسلم یُونی وَرسٹی کے پروفیسر مین تھے۔

ایک دِن میں حسبِ دستور پڑھ رہا تھا اور مولوی صاحب کمبل تانے پڑے تھے کہ کسی عربی کے فقرے پر اٹک گیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "رُک کیوں گئے؟" میں نے کہا "جی عربی ہے۔" بولے۔ "تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "جی ممکن ہے کوئی قرآن کی آیت ہو، غلط پڑھ جاؤں گا۔" فرمایا۔ "آپ پڑھیے، عذاب ثواب مجھ پر ہوگا۔" میں نے بھی دھڑ سے عربی کو اُردو کی طرح گھسیٹ ڈالا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "سُبحان اللہ، سُبحان اللہ! مولوی نذیر احمد کے پوتے اور قابلیت کا یہ حال!" اس وقت ہم اپنے آپ کو بڑا قابل سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب کا کہنا بہت بُرا لگا۔ پھول کر بیٹھ گئے۔ اب مولوی صاحب لاکھ کہتے ہیں۔ "ہاں صاحب پڑھیے۔ ارے بھائی آگے چلو۔" مگر یہاں گُم صُم بیٹھے تاؤ کھا رہے ہیں۔ مولوی صاحب سمجھ گئے کہ صاحب زادے اکڑ گئے۔ اُٹھ بیٹھے اور کمبل ہٹا کر بولے۔ "بہت غصّہ آتا ہے آپ کو؟" میں نے کہا "جی ہاں، آتا ہے۔ یہ کوئی میرا قصُور ہے کہ میں مولوی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟ نہیں آتی عربی مجھے۔" فرمایا،

dasarulkutub.blogspot.com

ارے بھئی تو میں نے کیا تمھیں منع کیا ہے، عربی بھی پڑھ لیا کرو۔" مَیں نے کہا۔ "بس مولوی صاحب۔ پڑھائی تو آج ختم ہو گئی۔ کل سے یہاں نہیں آؤں گا۔" مولوی صاحب سمجھے مذاق سے کہہ رہا ہوں، ہنس کر چپکے ہو رہے۔ مگر میں اس دن کے بعد نہ تو مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج۔ کئی دن بعد میں اپنے ماموں کے ساتھ لال کنویں سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے مولوی صاحب آتے دکھائی دیے۔ ماموں سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس لیے وہ لپک کر مولوی صاحب کی طرف چلے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ماموں نے سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب نے فرمایا "نہیں پہلے ان سے۔۔۔ یہ دُودھ پیتے ہوئے شاگرد ہیں۔" مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہاں بھئی استاد زادے ہیں ہمیں تو ان کا احترام ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔" گویا اوپر سے پانچ جوتے اور مار دیے۔ ماموں نے بعد میں بتایا کہ مولوی صاحب نے تمھارے دادا سے بھی ایک زمانے میں پڑھا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مولوی صاحب سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی۔ انھوں نے ساقی کے لیے کچھ لکھا بھی مگر تعلیم کا دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد مولوی صاحب کو کراچی میں دیکھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر بن گئے تھے۔ انھیں ترقی کالج والوں نے "خوشامدانہ" دیا تھا۔ مولوی صاحب ڈاکٹر اشتیاق کے بھی اُستاد رہ چکے تھے۔ اس لیے انھیں خاص طور پر جا کر لایا گیا تھا۔ میں نے کوئی بیس سال کے بعد مولوی صاحب کو دیکھا۔ بالکل سوکھ گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ بہرے بھی ہو گئے تھے۔ میں آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گیا۔ اُن کے لڑکے نے چیخ کر ان کے کان میں کہا "شاہد احمد دہلوی ہیں۔" فرمایا۔ "اچھا!" پھر بڑی محبت سے دیکھ کر بولے۔ "بھائی، اندھا ہو گیا۔ بہرا ہو گیا۔ معاف کرنا۔" میرا دل بھر آیا، کچھ نہ کہہ سکا۔ بس یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ کسی نے بعد میں بتایا کہ وزیر مہاجرین شاگرد ہیں۔ مگر مولوی صاحب کے پاس رہنے کو گھر تک نہیں ہے۔ کسی نے توجہ بھی دلائی مگر دعا قبول نہ ہوئی۔ مالی دشواریوں، بیماریوں اور سخت پریشانیوں میں چند مہینے ہوئے یہ آفتابِ علم و ادب کراچی کے ایک بوسیدہ سے کمرے میں غروب ہو گیا۔

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی

خواجہ میر درد کی بارہ دری کسی زمانے میں بارہ دری ہو تو ہو، ہم نے تو جب سے ہوش

سنبھالا اس بارہ دری میں چند پرانے گھروندے ہی دیکھے۔ انھی گھروندوں میں سے ایک میں خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی رہتے تھے۔ میں نے بچپن میں انھیں اپنے والد کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ سُرخ و سپید رنگ، سفید کھلواں ڈاڑھی، گول چہرہ، بھاری ڈیل، اُنگشتنیا تگندے پڑا ہوا فرغل، سر پہ کبھی صافہ کبھی ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا اور بہت تھا مگر خود ہی لکھتے۔ ان کی تحریر شکستہ کی تحریر ہوتی تھی کہ پڑھنے ہی میں نہ آتی۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ان کے ہاں جانے کا پہلا اتفاق ہوا۔ پتا پوچھتا پاچھتا ان کے گھر پہنچا۔ کنڈی کھٹکھٹائی، غالباً کہیں قریب تھے، خود ہی دروازے میں آ گئے۔ مجھے جانتے نہ تھے، پوچھا۔ "کون ہو بھائی؟" میں نے اپنا نام بتایا، کوئی اثر نہ ہوا۔ باپ کا نام بتایا، بے قرار ہو کر سینے سے لگا لیا۔ برابر والی مردانی بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا۔ بولے۔ "تم تو بھتیجے ہو۔ تمھارے ابا مجھے سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ہائے اب وہ اگلی سی وضع داریاں کہاں! اچھا بتاؤ گھر میں تو سب خیریت ہے؟ تم آج کیسے آئے؟" میں نے کہا۔ "ایک ادبی ماہنامہ دلّی سے جاری کرنے کا ارادہ ہے۔" پوچھا "نام کیا رکھا؟" میں نے کہا۔ "ساقی۔" خوش ہو کر بولے۔ "اچھا نام ہے۔ بدِہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت۔" بیسیوں شعر ساقی کے سنا ڈالے۔ "ہاں بھئی ساقی کے لیے ضرور لکھوں گا۔ بھتیجے کے لیے ضرور لکھوں گا۔ نثر بھی اور نظم بھی۔" اتنے میں ایک ان سے بھی زیادہ معمر بزرگ بیٹھک میں در آئے۔ کرخنداروں کا سا لب و لہجہ۔ دروازے ہی میں سے پھکڑپن شروع کر دیا۔ ہمارے ایک اجنبی آدمی کو دیکھ کر سنبھل گئے۔ فراق صاحب نے کہا۔ "بھائی بشیر کے صاحب زادے ہیں۔ رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔" انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور فراق صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ فراق صاحب نے کہا "اب دلّی میں کیا رہ گیا ہے؟ نظم میں تم ہو، نثر میں میں۔ باقی اللہ کا نام ہے۔" میں نے چونک کر ان بزرگ کی طرف دیکھا۔ وہ دو باتیں کر کے رخصت ہوئے۔ اُن کا قدم دہلیز سے باہر نکلا ہی تھا کہ فراق صاحب نے کہا "اور یہ بھی کیا ہیں، بس میں ہی رہ گیا ہوں۔" میں نے پوچھا۔ "یہ کون صاحب تھے؟" بولے "تم انھیں نہیں جانتے؟ اماں یہ خود دہلوی تھے۔"

اِسی بھول پن میں بعض باتیں بڑی عجیب بھی کہہ جاتے تھے مثلاً یہ کہ لال قلعہ جب بن رہا تھا

qasrulkutub.blogspot.com

تو لوہے کے بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھے ہوتے تھے۔ اُن میں چربی کھولتی رہتی تھی۔ اینٹ بنانے کے بعد پہلے اُس چربی میں پکائی جاتی۔ جب وہ خوب سُرخ ہو جاتی تو اسے نکال کر دیواروں میں چُن دیا جاتا۔ فرماتے تھے کہ سُندربن میں ہم نے ایک پرندہ ایسا دیکھا جس کا صرف ایک پر تھا۔ دوسرے پر کے بدلے ہڈّی کا صرف آنکڑا سا تھا۔ نر کا دایاں پر ہوتا ہے اور مادہ کا بایاں۔ جب انھیں اُڑنا ہوتا تو نر اور مادہ آکر ملے میں آنکڑا ڈال کر پھُر سے اُڑ جاتے۔ اُن کی ایسی بے پر کی اُڑانے میں بھی ایک لطف تھا۔

ناصر نذیر فراق کوئی چار سال اور جیے۔ مفلسی اور بڑھاپے نے اُن کا دم توڑ رکھا تھا۔ ساقی کے لیے اُنھوں نے قسط وار "لال قلعہ کی جھلک" لکھی۔ بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔ مخزن کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جب مخزن بند ہو گیا تو اُنھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ساقی کے لیے لکھا۔ لکھنے میں انھیں بڑی زحمت ہوتی تھی مگر مرتے دم تک اپنی وضعداری پر قائم رہے۔ بڑی محبت سے ملتے تھے اور مل کر خوش ہوتے۔ آخری بار اُن سے ملا تو پردہ کروا کے اندر گھر میں بُلوا لیا۔ ایک جھلنگے میں لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ ان کے صاحبزادے ناصر خلیق نگار بہت پریشان تھے۔ فراق صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولے۔ "لو بھئی شاہد میاں، چلنے کا وقت آ پہنچا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

بھئی نتھے، ہمارے مرنے کی خبر ان کو ضرور دینا۔" میرا دل بھر آیا۔ مُنھ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُن سے مصافحہ کر کے باہر چلا آیا۔ نگار صاحب نے بتایا کہ "ابا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی دم کے مہمان ہیں۔"

تیسرے دن اُن کی سُناؤنی سُنی۔ خواجہ میر درد کی یادگار ختم ہوئی۔ اردوئے معلّیٰ کا کوئی لکھنے والا نہ رہا۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ اُستاد کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ ان کی ناتمام تصنیف "ڈراما اکبر" کی تکمیل فراق صاحب ہی نے کی تھی۔ افسوس کہ زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہ دی تھی کہ کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار چھوڑتے۔ عرصہ ہوا

سر عبدالقادر کی فرمائش پر ایک ناول "المورکھا" لکھنا شروع کیا تھا۔ مخزن بند ہوا تو ان کی ہمت بھی پست ہو گئی۔ پھر اور لوگوں کے اصرار پر اسے مکمّل بھی کر لیا تھا مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ نہ جانے اُس مسوّدے کا کیا حشر ہوا۔

نوّاب سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی لوہارو کی نوّابی کے اصل وارث تھے مگر انگریزوں نے اُن کے والد کو گدّی سے لاحق کر کے ان کے چچا کو گدّی پر بٹھا دیا تھا۔ اُن کے والد پر الزام لگایا گیا تھا کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ نواب سائل پہلے لال دروازے میں رہتے تھے، پھر فراش خانہ میں اُٹھ آئے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے انھیں اپنے بچپن میں ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ عجب شان و شوکت کے بزرگ تھے۔ میدہ و شہاب رنگ، گول چہرہ، سفید برّاق ڈاڑھی، سنہری فریم کی عینک، سر پر چوگوشیہ زرکار لیس کی مخملی ٹوپی۔ قریب سے دیکھو تو اُس پر زردوزی میں سائل دہلوی لکھا ہوا۔ چست پاجامہ، چوڑیاں پنڈلیوں تک پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی۔ بائیں ہاتھ میں چاندی کی مُٹھ کی چھڑی، دائیں ہاتھ میں چھ انچ لمبا سگار۔ مخصوص ترنّم سے غزل پڑھتے اور سُننے والوں کو پھڑکا دیتے۔ پھر نواب صاحب کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مشاعروں میں، پارٹیوں میں، شادی بیاہ کی محفلوں میں، اور جب میرے والد کو آخری عمر میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو انھوں نے نواب سائل کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اکثر میرے والد ان کے ہاں جاتے اور کبھی کبھی نواب صاحب بھی ہمارے ہاں آتے۔ کلام دکھانے کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ شاگرد نے دس دس پندرہ پندرہ غزلیں (داغ کے رنگ میں اور زمین میں بھی) روزانہ کہنی شروع کر دیں۔ نواب صاحب کوئی ترمیم کرتے تو شاگرد صاحب اُن سے اُلجھ جاتے اور ان کی اصلاح کو نہ مانتے۔ لہٰذا اُستادی شاگردی زیادہ دن نہ چل سکی، دوستی البتہ قائم رہی۔

نواب سائل بڑے حلیم الطبع اور بردبار آدمی تھے۔ دلّی کے معززین میں شمار ہوتے اور انگریزوں میں بھی ان کی خاصی پوچھ تھی۔ ان کا کلام خود اُن کی شہرت کو چار چاند لگاتا تھا مگر اُن کی بعض باتیں بالکل بچگانہ ہوتی تھیں۔ مثلاً ٹوپی پر نام لکھوانا یا کسی نہ کسی بہانے یہ جتانا کہ "میں

qasarulkutub.blogspot.com

"داغ کا داماد ہوں"۔ اُن کی یہ کمزوری اُن کے اکثر مقطعوں میں بھی ظاہر ہوتی، مثلاً:

جنابِ داغ کے داماد ہیں ہم دِلّی والے ہیں

یا وہ مقطع جس پر لکھنؤ والوں نے بہت اعتراض کیا تھا:

اُنگلیاں اُٹھنے لگیں داغ کے داماد آئے

ایک دفعہ مَیں اُن سے ساقی کے لیے غزل لینے اُن کے گھر گیا۔ اور بھی کئی احباب اور شاگرد جمع تھے۔ سائل صاحب نے اپنی تازہ غزل سُنائی۔ ہر شعر پر واہ وا ہوتی رہی اور وہ یہی فرماتے رہے " مَیں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہلوا رہی ہے جو گھر میں بیٹھی ہے — داغ کی بیٹی کہلوا رہی ہے"۔ اصل بات یہ تھی کہ نواب صاحب کو بیگم سے اور انھی کی وجہ سے اُستاد سے بے حد محبت تھی۔ ورنہ بیگم صاحبہ داغ کی حقیقی بیٹی نہیں تھیں بلکہ اُن کی سالی کی صاحب زادی تھیں، داغ نے انھیں گود لے لیا تھا۔ اسی طرح اُن کا ایک مصرع تھا:

غالب میرے دادا تھے مَیں غالب کا پوتا ہوں

حالاں کہ نہیں تھے۔

اُردو فارسی میں اُن کی قابلیت مُسلّم تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے۔ چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح سے پیش آتے تھے اس لیے اکثر طالب علم انھیں گھیرے رہتے تھے۔

ایک دِن اس شعر پر دوستوں میں بحث چل نکلی ؎

خواہیم از خُدا نخواہیم از خُدا

دیدن رُخِ حبیب و نہ دیدن رُخِ رقیب

لف ونشر مرتّب کے اعتبار سے اس شعر کی صورت یوں بنتی ہے کہ:

خواہیم از خُدا دیدن رُخِ حبیب

نخواہیم از خُدا ندیدن رُخِ رقیب

لہٰذا شعر بے معنی ہو جاتا ہے۔ چناں چہ یہ مسئلہ سائل صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ پہلے تو وہ بھی چکرائے مگر غور کرنے کے بعد بولے "کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ رقیب کے بدلے حبیب ہونا چاہیے"۔

نوابوں میں عام طور سے اتنے شریف طبیعت کے لوگ نہیں ہوتے جتنے کہ نواب سائل۔ اُن کے بڑے بھائی نواب نابان اُن کی ضد تھے۔ گالیاں دینے پر آتے تو شیطان بھی کانوں پر ہاتھ دھرتا۔ اکثر سائل صاحب پر برس پڑتے اور وہ مغلّظات سُناتے کہ الٰہی توبہ۔ مگر وہ بچارے مُنھ سے اُف تک نہ کرتے۔ دَبی زبان سے اتنا البتہ کہہ دیتے کہ "بھائی جان، گالیاں آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر"۔ اسی طرح حبیب بیخود صاحب مشاعروں میں برہم ہو کر مادر چادر پر اُتر آتے تو سائل صاحب جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ دِلّی میں بیخود والوں اور سائل والوں کے بڑے بڑے پالے ہوتے۔ اکثر مشاعروں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی۔ سائل صاحب ان جھگڑوں سے بہت گھبراتے تھے۔ اور بالآخر انھوں نے دِلّی کے مشاعروں میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بیخود اور سائل کے اختلاف کی اصل وجہ داغ کی جانشینی تھی جس کے مدّعی دونوں تھے۔

آخری عمر میں سائل صاحب کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ایک رکشا رکھ لی تھی۔ اس میں ان کا سوار ہونا اور اس میں سے اُترنا ہی ایک بڑا مرحلہ ہوتا تھا۔ ایک دِن اس رکشا کا پہیہ لال کنویں پر ٹریم کی نیکھ میں ایسا اڑا کہ رکشا اُلٹ گئی۔ سائل صاحب کے سر میں سخت چوٹ آئی۔ لوگوں نے دوڑ کر انھیں اٹھایا۔ ہائے ہائے کرتے تھے اور اپنی بے بسی پر روتے تھے۔ مَیں بھی پرسشِ احوال کو گیا۔ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے "ایک وقت وہ تھا کہ جب ابّا جان کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو مَیں لپک کر اُس کی دُم پکڑ اوپر جا بیٹھتا۔ اب یہ حال ہے کہ دُوسروں کے سہارے کے بغیر اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا"۔

سائل صاحب نے ہزاروں غزلیں کہیں۔ ان کے دیوان بھی چھپے مگر اُن کا عمر بھر کا حاصل نظروں سے پوشیدہ ہی رہا۔ نورجہاں اور جہانگیر کے عشق پر ایک مثنوی لکھ رہے تھے جس کے ۵ ہزار شعر کہہ چکے تھے۔ افسوس کہ یہ خزینہ دفینہ ہو کر رہ گیا۔

مولوی احتشام الدّین

مولوی احتشام الدّین صاحب دِلّی کے حقّی خاندان کے سپوت تھے۔ علی گڑھ کے پُرانے گریجوایٹ۔ عرصے تک وہیں لائبریرین رہے۔ کتابیں پڑھتے کیا تھے، نگلتے تھے۔ انھوں نے سارا

qasarulkutub.blogspot.com

اُردو ادب چاٹ رکھا تھا۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ طلسمِ ہوش رُبا اور بوستانِ خیال جیسی ضخیم کتابیں انھیں ازبر تھیں۔ انھیں یہ تک یاد تھا کہ کون سا لفظ کس کتاب میں کس صفحے پر آیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے جب اُردو کی بڑی لُغت کوئی بتیس تینتیس جلدوں میں مرتّب کرنی شروع کی تو بڑے بڑے جغادری بطور مددگار رکھے، مگر سب کے سب رسّے تڑا کر بھاگ گئے۔ بالآخر احتشام الدّین صاحب اُن کے ہتّھے چڑھے۔ حیدرآباد دکن میں ان کا کمرہ دیکھنے کی چیز تھا۔ سیکڑوں ننھے ننھے خانوں کی الماریاں دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ مولوی صاحب بیچ میں بیٹھے پرچوں پر الفاظ لکھتے اور ان خانوں میں ڈالتے رہتے۔ مولوی صاحب کے کام کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب تک جاگتے رہتے یہی کام کرتے رہتے۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالتے اور سند کے لیے کسی مستند کتاب کا حوالہ بھی دیتے۔ جب انجمن دِلّی آگئی تو مولوی صاحب نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں یہی دھندا پھیلایا۔ انھیں اپنے کام میں اتنا انہماک ہوتا تھا کہ کھانے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ اُن کی بیگم صاحبہ اکثر یاد دہانی کراتیں اور اکثر خود آکر کہتیں، تب کہیں کھانا کھانے اُٹھتے۔ تہمد اور بنیان پہنے، پسینے میں شرابور، کتابوں اور پرچیوں کے ڈھیر میں دبے رہتے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کام کے لیے انجمن کو حیدرآباد سے جو امداد ملتی تھی، وہ بند ہوگئی تو مولوی عبدالحق صاحب نے ان سے کہا کہ کام روک دیا جائے۔ مگر مولوی صاحب اسی تن دہی سے کام کرتے رہے۔ لُغت ختم پہ آرہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جلدی ختم ہو تو اس کی چھپائی کا کام شروع ہو۔ کم و بیش بیس سال کی محنت تھی بلکہ عمر بھر کی جانفشانی کا حاصل۔ مولوی عبدالحق صاحب کے ہاں سے تنخواہ آنی بند ہوگئی مگر مولوی صاحب کا کام بند نہ ہُوا۔ انھیں اپنے کام سے محبّت ہوگئی تھی، جنُوں ہوگیا تھا۔ بڑھاپا۔ غذا کم محنت زیادہ۔ صحت نے جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ دوستوں اور گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ کام چھوڑیے اور آرام کیجیے۔ مگر مولوی صاحب کہتے کہ اگر یہ کام نہ کروں تو پھر کیا کروں؟ غرض تنخواہ نہ ملنی تھی، نہ ملی۔ مولوی صاحب اسی طرح کام کرتے رہے۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا زبردست کارنامہ دیوانِ حافظ کا

منظوم ترجمہ تھا۔ مولوی صاحب نے ترجمہ بقیدِ بحر کیا تھا۔ افسوس کہ یہ کاوشِ ذہنی زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں برباد ہوئی۔

مولوی احتشام الدّین جیسا محقّقِ الفاظ ہم نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ ہمیں بھی اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا مگر مولوی صاحب کے سامنے ہماری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی رہ جاتی۔ مثلاً مولوی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا: "یہ اُردو زبان بھی عجیب زبان ہے۔ فقرے کے لحاظ سے ایک لفظ کئی کئی معنی تو دیتا ہی ہے مگر "اچھا" بہ معنی بُرا اور "بُرا" بہ معنی "اچھا" کسی اور زبان میں کبھی سُنا؟" اور زبان کا تو ذکر ہی کیا؟ ہم نے تو اُردو میں بھی ان الفاظ کے کبھی ان معنوں میں استعمال ہونے پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جو مولوی صاحب نے جتایا تو معلوم ہُوا کہ ہم روزانہ ان دونوں لفظوں کو متضاد معنی میں بولتے ہیں، مگر لفظوں کے اس نازک پہلو کو دیکھنے کی آج تک توفیق نہ ہوئی۔ اس قسم کے سیکڑوں لفظ مولوی صاحب کو یاد تھے اور لُغت میں تو خُدا جانے، الفاظ کے کتنے خزانے تھے۔

ایک دن سُنا کہ مولوی صاحب بیمار ہیں۔ مَیں خیریت معلوم کرنے گیا۔ دیکھا لیٹے لیٹے پرچیاں اُلٹ رہے ہیں۔ کئی دن سے بخار تھا، اُس وقت بھی پنڈا پھُنک رہا تھا۔ اُن کے صاحب زادے میاں شان الحق بہت پریشان تھے۔ انھیں تسلّی دے کر چلا آیا۔ دو دن بعد معلوم ہُوا کہ مولوی صاحب ارون ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ ہسپتال جا کر اُن سے ملا تو بہت خفیف آواز میں شکریہ ادا کیا۔ چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ بولے "اب کے اچھے ہونے کے بعد ساقی کے لیے ایک سلسلۂ مضامین لکھوں گا۔" مگر دُوسرے دن سُنا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

مِرزا چپاتی

مِرزا فخرالدّین نام، فخر تخلّص، عُرف مرزا چپاتی۔ دِلّی کے شاہی خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، گول سفید داڑھی، کسرتی

qasarulkutub.blogspot.com

بدن، سروقد، بدن میں سفید انگرکھا، آڑا پاجامہ، سر پہ چوگوشہ، پاؤں میں سلیمے کی جوتی۔ واقعی مغل شہزادہ دکھائی دیتے تھے۔ بڑھاپے میں عسرت نے گھیر لیا تھا۔ سر پہ چوڑی لیس کی ٹوپی، گلے میں پھٹا ہوا ململ کا کرتا، پاؤں میں لیتڑے ہکائے پھرتے تھے۔ مگر مرزا کی خوش مزاجی میں آخر تک فرق نہ آیا۔

جب تک پیسہ رہا خوب اللے تللے سے گزری۔ شاید ہی کوئی بازی ان سے چھوٹی ہو۔ کبوتر، لال اور بیدڑیاں اڑاتے تو اوروں کو بھی دیکھا لیکن طوطے اڑاتے مرزا چپاتی ہی کو دیکھا۔ پتنگ بنانے اور پیچ لڑانے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ آخر آخر میں بیرم خاں کے ترائے کے قریب ایک بوسیدہ سی دکان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ پتنگیں بناتے اور پیٹ پالتے۔

غضب کے تونتے تھے۔ "ت"، "کوٹ" بولتے۔ زندہ دل اور قلندر باز تھے۔ سیر سپاٹے کے دل دادہ۔ ذرا رت بدلی اور انھیں دور کی سوجھی۔ برسات کا چھینٹا پڑا اور انھوں نے قطب کی راہ لی۔ کسی کھنڈر کے ایک در میں مرزا بھی اپنی گڈیاں لگا کر بیٹھ جاتے۔ کانپ ٹھڈے چاقو سے چھیلتے رہتے اور انھیں جھکا جھکا کر دیکھتے رہتے۔ دمڑچل، دھیل چل، پٹیل، پری، بھیڑیا، دو دما، کل دما، بیسیوں قسم کی گڈیاں ان کے پاس تیار رہتیں۔ برکھا رت ساری قطب ہی میں گزارتے۔

مرزا کی وجہ تسمیہ بھی عجیب ہے۔ مرزا بڑے چاؤ اور ارمانوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کی اماں نے منت مانی تھی کہ جب میرا بچہ بڑا ہوگا تو قطب صاحب کی درگاہ پہ اس کے ہاتھ سے حلوہ اور چپاتیاں بٹواؤں گی۔ بارھویں برس ان کی منت بڑھائی گئی تو مرزا نے چپاتیاں بانٹنی شروع کیں۔ لینے والے "مرزا چپاتی"، "مرزا چپاتی" کہہ کہہ کر چپاتیاں مانگتے تھے۔ اسی دن سے مرزا کا نام مرزا چپاتی مشہور ہو گیا۔

مرزا صاحب اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے ہر دل عزیز تھے۔ اپنے خاندانی وقار کی وجہ سے امرا میں بلائے جاتے تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے اس لیے مشاعروں میں بلاؤ ہوتی۔ تحت لفظ پڑھتے تو لوگ اور بھی محظوظ ہوتے۔ ان کے اکثر اشعار دلی والوں کو ازبر ہو گئے تھے۔ اس ایک شعر پہ مرزا نے مشاعرہ اڑا کر رکھ دیا ؎

بنالی شوق میں شداد نے پر یہ نہیں سمجھا — نہ میں جنت کے قابل ہوں نہ جنت میرے قابل ہے

ایک مسالمہ میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ؎

شمر نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

ان کے تین شعر اور یاد آ گئے ؎

صراف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو — ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو
دل دل کے ہیں جو تنیس عدد حرف کبھی دو ہی — بے لکھے سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو
ان چاروں کو جو دوئے ستم دیکھا ہے فخرو — اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنر کو

دلی کی دو ڈیرہ دار طوائفیں اب سے کوئی چالیس سال پہلے بہت مشہور تھیں۔ نام تو خبر نہیں ان کے کیا تھے، دونی اور چونی کہلاتی تھیں۔ دلی کے شہزادوں میں ایک بڑی دھوم دھام کی شادی ہوئی۔ اس میں دونی جان کا مجرا تھا۔ جب مجرا جم گیا، اور دونی جان فرمائشی گانے سنا چکیں تو انھوں نے اپنی پسند کے گانے سنانے شروع کیے۔ مرزا چپاتی نے کہا۔ "بائی جی ذرا ٹھہرنا۔ ایک شعر ہو گیا ہے پہلے وہ سن لو۔" مجلس میں سناٹا ہو گیا۔ مرزا نے شعر پڑھا ؎

ڈھستے ڈھستے ہو ڈئی اِتنی مٹ — ساٹ پیسے ئی ڈونی رہ ڈئی
(گھستے گھستے ہو گئی اتنی مت — سات پیسے کی دونی رہ گئی)

محفل میں ایک قہقہہ پڑا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دونی جان بڑی نفقے کی خاتون تھیں۔ ان کی تیوری پہ بل سا آیا، مگر انھوں نے مجلس میں کھنڈت نہ ڈالنی چاہی۔ خود بھی ہنسنے لگیں۔ اور بولیں۔ "سبحان اللہ مرزا صاحب۔ میں تو بیماری میں بالکل ست گئی تھی۔ اب بھی مجھ میں پوری سی جان کہاں آئی ہے۔ صاحب عالم نے یاد فرمایا تھا، اس لیے حاضر ہو گئی۔" صاحب خانہ نے کہا "بائی جی، تم تو جانتی ہی ہو مرزا کی عادت شوخی کی ہے۔ ہاں، آپ سنائیے کیا سنا رہی تھیں۔" اور گانا پھر شروع ہو گیا۔

مرزا بڑے لاڈ پیار میں پلے اس لیے کورے جاہل رہے مگر ان کی گفتگو سے جہالت ظاہر نہ ہوتی تھی۔ لمبی عمر پائی۔ آخری وقت اچھا نہ گزرا۔ عسرت و تنگ دستی میں مرے۔

qasarulkutub.blogspot.com

نوّابؔ تاباںؔ

نوّاب تاباں نوّاب سائلؔ کے بڑے بھائی تھے۔ بالکل انھی کی طرح میدہ و شہاب رنگ، ویسا ہی ڈیل ڈول، ناک نقشہ اور لباس۔ مگر دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے نہ جانے کیا کد تھی کہ ہمیشہ بُرا بھلا ہی کہتے رہتے تھے۔ بلکہ گالیاں تک دینے سے نہ چُوکتے تھے۔ اور گالی بھی ایک سے ایک نئی تراشتے تھے۔ سائل بے چارے سر جُھکا کر کہتے "بھائی جان، آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر"۔ اس پر دم اور بگڑتے اور ایسی سناتے جو دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ مگر کیا مجال جو سائل صاحب کی پیشانی پر بل آجائے۔ وہ ان کی بزرگی کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اونچی آواز میں اُن کے سامنے بولتے بھی نہیں تھے۔ نوّاب تاباں بھی شاعر تھے۔ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ حکیم اجمل خاں کے ہاں شرفائے دہلی کا جمگھٹا رہتا تھا۔ حکیم صاحب بھی عجیب خوبیوں کے آدمی تھے۔ یہ جتنے بڑے طبیب تھے اتنے ہی بڑے لیڈر اور اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ ایک دفعہ شبلی نعمانی دِلّی آئے تو حکیم صاحب کے ہاں مہمان ہوئے۔ نوّاب تاباں کی تعریف غائبانہ بہت سُن چکے تھے۔ ان سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ حکیم صاحب نے سوچا کہ نوّاب کو اگر یہاں بُلایا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات کا بُرا مان جائیں۔ اس لیے ایک صاحب کے ساتھ شبلی کو اُن کے گھر بھیج دیا۔ نوّاب صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزّت سے بٹھایا۔ خاطر تواضع کی۔ شبلی کی فرمائش پر اپنی غزل سُنانی شروع کی۔ شبلی بھی ذرا مدمغ آدمی تھے خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ تاباں نے دیکھا کہ مولانا ہُوں ہاں بھی نہیں کرتے تو جھنک کر بولے۔ "ہاں صاحب، یہ شعر غور طلب ہے"۔ اور غزل کا اگلا شعر سُنایا۔ مولانا نے فرمایا "سُبحان اللہ، خوب شعر کہا ہے آپ نے"۔ بس پھر تاباں آپے تو جائیں کہاں؟ بگڑ کر بولے " ابے لنگڑے، میں نے تو یہ شعر تین دن میں کہا اور تو نے اسے ایک منٹ میں سمجھ لیا بیٹا۔ یہ شعر العجم نباشد ---!" اس کے بعد ان کی گالیوں کا پٹارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈ چھڑانا مشکل ہوگیا۔ ویسے اپنی روزمرّہ کی زندگی میں نوّاب تاباں بڑے زندہ دل اور دوستوں کو کھلا پلا کر خوش ہونے والے آدمی تھے۔

مُلّا واحدی

کوچہ چیلاں میں، جہاں میر جالب کا مکان تھا، ذرا اور آگے بڑھ کے مُلّا واحدی کا مکان تھا۔ واحدی صاحب کی طرح اُن کا مکان بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ اَدب، مذہب، صحافت اور سیاست کی اکثر ہستیوں نے اسی مکان میں فروغ پایا۔ یہاں سے متعدد رسالے جاری ہوئے۔ واحدی صاحب عمر بھر بڑے خاموش اور مخلص کارکن رہے۔ نام و نمود کی اُنھوں نے کبھی پروا نہیں کی۔ دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست رہے۔ دِلّی میں اُن کی بہت جائداد تھی۔ خدمت کے جنون نے انھیں کُھک کر دیا۔ آخر میں بس یہی مکان رہ گیا تھا۔ جس میں ۱۹۴۷ء تک رہے۔ دِلّی سے انھیں عشق تھا۔ کہیں باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ شملے گئے تو ایک گاڑی سے گئے اور دُوسری سے لوٹ آئے۔ واحدی صاحب بڑے محنتی اور اصُولی آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت کام کیا۔ بیسیوں ایڈیٹر اور سیکڑوں ادیب پیدا کیے۔ خواجہ حسن نظامی اپنی ابتدائی زندگی میں واحدی صاحب ہی کے رہینِ منت رہے۔ خواجہ صاحب نے بھی آخر تک حقِ دوستی نبھایا۔ علّامہ راشد الخیری سے "شامِ زندگی" واحدی صاحب ہی نے لکھوائی۔ علّامہ آزاد مزاج آدمی تھے۔ دِنوں قلم ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ لوگ خوشامدیں کرتے، معاوضے پیشگی دے جاتے مگر وہ توجہ نہ کرتے۔ واحدی صاحب نے خبر نہیں کیا منتر پڑھا کہ علّامہ کو سولہ آنے اپنے قبضے میں کر لیا۔ روزانہ انھیں ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیتے اور جب مقررہ صفحوں کی تعداد پُوری ہو جاتی تو انھیں کھول دیتے۔ یوں یہ پُوری کتاب لکھوائی گئی۔ خواجہ صاحب دِلّی سے تین میل دُور بستی نظام الدین میں رہتے تھے مگر روزانہ واحدی صاحب کے ہاں آتے اور انھی کے ہاں تصنیف و تالیف کا کام کرتے۔ خواجہ صاحب کے ایک اور مخلص دیرینہ بھیا احسان تھے۔ جو تھے تو میرٹھ کے رئیسوں میں سے مگر رہتے دِلّی میں تھے۔ واحدی صاحب کی طرح یہ بھی وضع دار اور دِل والے تھے۔ اخبار کا چسکا اور ادب کا روگ انھیں بھی ساری عمر رہا۔

qasaidulkutub.blogspot.com

پنڈت اَمر ناتھ ساحرؔ

پنڈت امر ناتھ صاحب دِلّی کے لائقِ فخر لوگوں میں سے تھے۔ عُمر ستّر اسّی کے درمیان۔ اُونچا پُورا قد، بہت لمبی چوڑی نما داڑھی۔ ریٹائرڈ تحصیلدار تھے۔ میر ناصر علی کی طرح ان کی پنشن پانے کی مدّت بھی علّامہ کی مُدّت سے زیادہ ہو چکی تھی۔ شاعری کے عاشق اور اُستاد تھے۔ شعر اردو میں بھی کہتے تھے اور فارسی میں بھی، مگر اتنے گہرے رُوحانی اور ادق عرفانی مضامین باندھتے کہ سامعین کے پلّے کچھ نہ پڑتا۔ پنڈت جی دلّی کے پُرانے وضع دار ہندوؤں کا آخری نمونہ تھے۔ ان کی عبا قبا، جُبّہ و دستار دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہوتا کہ یہ ہندو ہیں یا مُسلمان۔ ہم نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ دِلّی کے ہندو مُسلمانوں کے لباس اور بول چال میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ پنڈت جی کی اُردو بھی چغلی نہیں کھاتی تھی۔ یہی کیفیت ہم نے پنڈت دتاتریہ کیفی اور تربھون ناتھ زار کی بھی دیکھی۔ پنڈت جی بہت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک دفعہ چند لڑکے رات کے گیارہ بجے اُن کے گھر پہنچ گئے۔ چوڑی والاں سے جو راستہ سیتا رام کے بازار کو جاتا ہے اُس کے سرے پر اُن کا بالاخانہ تھا۔ کنڈی کھڑکی تو پنڈت جی ہاتھ میں لالٹین لیے زینے پر سے اُترے۔ پوچھا "کیسے زحمت فرمائی؟" لڑکوں نے کہا۔ "ہمیں آپ کا کلام سُننے کا بہت اشتیاق ہے۔ صبح کی گاڑی سے ہمیں واپس جانا ہے۔" پنڈت جی نے فرمایا۔ "کیا مضائقہ ہے۔" اور خندہ پیشانی سے سب کو اپنے ساتھ اُوپر لے گئے۔ کمرہ کھول کر آرام سے بٹھایا۔ چائے پان پیش کیا اور اپنا کلام سُنا کر انھیں رخصت کرنے نیچے تک آئے۔ اسکول اور کالج کے لڑکے جب چاہتے پنڈت جی کو مشاعرے کی صدارت کے لیے لے جاتے۔ بعض بد تہذیب لڑکے پنڈت جی سے بد تہذیبی کرجاتے تو پنڈت جی ناراض ہو جاتے مگر پھر فوراً من بھی جاتے۔ کالج کے مشاعرے میں ایک صاحب زادے نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا ۔

یہ کہنا بیٹا جا کر اپنی ماں سے
کہ تم رُوٹھی ہوئی کیوں آبا میاں سے

پنڈت جی کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ بولے "کیا مضائقہ ہے صاحب زادے تمھارے باپ سے شکایت

کروں گا۔" دُوسرے لڑکوں نے کہا۔ "پنڈت جی اس گُستاخ کو معاف کر دیجیے۔ ہاتھ جوڑ رہا ہے۔" پنڈت جی مُسکرا دیے اور بولے۔ "اِدھر لاؤ اسے میں اس کے کان کھینچوں گا۔" محبت سے کان کھینچ کر بولے "کیا مضائقہ ہے۔ باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔ جاؤ۔" پنڈت جی خود بھی سالانہ مشاعرہ کرتے اور دُور دُور سے شعرا آ کر اس میں شرکت کرتے۔ پنڈت جی اُن کے قیام و طعام کا انتظام کرتے۔ دِلّی میں اُس مشاعرے کی دُھوم مچ جاتی۔ اُن کے بعد اس شان کے مشاعرے دِلّی میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

خلیقی دہلوی

اب سے چالیس پچاس سال پہلے "ادبِ لطیف" کی تحریک طاعون کی طرح پھیلی۔ اس کی محرک بڑی حد تک ٹیگور کی گیتا نجلی تھی۔ اُس دَور کے ادیبوں کو ایک نئی چیز ہاتھ آئی کہ ایسے بھی چھوٹے چھوٹے خیالی مضامین لکھے جا سکتے ہیں جن میں خوب صُورت فقرے اور اچھوتی ترکیبیں ہوں۔ چاہے مطلب کچھ بھی نہ نکلتا ہو۔ نیاز فتح پوری نے گیتا نجلی کا ترجمہ عرضِ نغمہ کے نام سے کر دیا اور انگریزی سے ناواقف ادیبوں نے اسی انداز پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بعض اچھے ادیب بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ یلدرم، نیاز، دِل گیر، مہدی افادی، ل احمد اور خلیقی دہلوی نے خوب خوب قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ اس جتھے کے پہلے سرغنہ شاہ دل گیر اکبر آبادی تھے۔ نقاد کے ایڈیٹر اور ان کے بعد دُوسرے لیڈر نیاز فتح پوری، نگار کے ایڈیٹر۔ اس ٹولی میں بیان کے ساتھ ساتھ خیال کے بانکپن کا جس نے سب سے زیادہ خیال رکھا وہ ایک صاحب تھے محمد دین خلیقی دہلوی۔ رہتے تو تجارت پیشہ آدمی، مگر ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ کوئی اچھوتی ترکیب سمجھ میں آجاتی تو گھنٹوں اس کا لُطف لیتے۔ لکھتے بہت کم تھے اور مختصر، مگر جو کچھ لکھتے یہ معلوم ہوتا کہ نگینے جڑ دیے ہیں۔ حافظہ اچھا پایا تھا۔ انھیں اپنے پیرے نثر پارے لفظ بہ لفظ یاد رہتے تھے۔ جس طرح شاعر اپنی غزل یا نظم سُناتا ہے یہ اپنی نثر سُناتے تھے۔ اُن کے اکثر فقرے آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کچھ اس طرح کے ہوتے تھے :

"ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ چشمے کا پانی شراب بن گیا ہے، شراب اس لیے بن گیا ہے کہ صبح کے وقت قدِ آدم نسائی آئینے اس میں معتدل کیے جاتے تھے۔" (یعنی عورتیں اس میں نہایا

qasarulkutub.blogspot.com

کرتی تھیں) خلیقی صاحب اپنے نثر پاروں کی داد پاتے تو ازراہِ انکساری فرماتے "ننگِ قلم ہوں"۔ باتیں کرنے میں بھی اکثر مغلق الفاظ بولتے تھے۔ یہ عادت انھیں غالباً مولانا عبدالسلام صاحب کی صحبت میں پڑی تھی، جن کی عالمانہ خوش گفتاری دلّی میں مشہور تھی۔ خلیقی صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ انھیں دل کا عارضہ ہو گیا تھا اور یہ بھی انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ مرض لاعلاج ہے۔ خاصے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ بیماری میں گھلتے چلے گئے۔ فرماتے تھے کہ "مجھے اس کی خوشی ہے کہ دل کی بیماری سے مر رہا ہوں"۔

مرزا حیرت دہلوی

دریبے میں پائے والوں کی طرف سے داخل ہو کر چند قدم چلنے کے بعد ایک تین در کی دکان بائیں ہاتھ کو آتی ہے۔ اس کے چبوترے کی طرف گاؤ تکیہ سے لگے ایک بزرگ بیٹھے رہتے تھے۔ گورا رنگ، سفید براق سر، سیدی ڈاڑھی، غلافی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، لبوں پر پان کی سرخی۔ یہ مرزا حیرت دہلوی تھے۔ بہت بڑے عالم تھے مگر ان کا دماغ صرف تبرائی سوچتا تھا۔ دلی میں چھاپے کی مشین سب سے پہلے انھوں نے ہی لگائی تھی اور کرزن گزٹ جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں جس کی چاہتے خبر لیتے، جس کی چاہتے ٹوپی اتار لیتے۔ شورش پسند آدمی تھے، طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے رہتے تھے۔ واقعۂ کربلا ہی سے انکار کر دیا اور حساب لگا کر بتایا تھا کہ جس زمانے میں اس کا وقوع بتایا جاتا ہے، گرمی کا موسم نہیں تھا بلکہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ مولانا حالی نے مسدس مدوجزرِ اسلام لکھی تو دنوں اس کی تردید و تضحیک میں مضامین لکھتے رہے۔ حالی فرماتے ہیں ع

عرب کچھ نہ تھا اِک جزیرہ نما تھا

مرزا حیرت نے اس پر فرمایا ؎

ذرا دیکھیے تو یہ کیا کہہ رہے ہیں
عرب کو جزیرہ نما کہہ رہے ہیں

ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن شائع ہوا تو اس کے فوراً بعد ہی مرزا حیرت کا ترجمۂ قرآن شائع ہو گیا۔

اور سائز بھی رکھا تو گز بھر کا۔ شبلی نعمانی کے ساتھ حیدرآباد دکن گئے ـــــ سالار جنگ کی خدمت میں دونوں پہنچے۔ شبلی نے مرزا کی تعریف کر کے تعارف کرایا۔ سالار جنگ نے مرزا سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ مرزا نے شبلی کی تازہ نظم سنانی شروع کر دی۔ شبلی نے ٹہوکا دیا تو چٹکی لے کر انھیں خاموش کر دیا۔ سالار جنگ نے ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔

باہر نکل کر شبلی نے پوچھا "یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟" بولے "تم سناتے تو تمھیں ایک چھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی، مجھے ہزار روپے تو مل گئے"۔

جب مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی چلی تو مرزا حیرت محمد علی کے طرف داروں میں ہو گئے اور "دُرّہ عمر" میں خواجہ صاحب کے خلاف لکھتے رہے۔ ایک دن مرزا حیرت اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بدمعاش نے کسی بات پر جھگڑا کر کے ان پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا مگر اس کم بخت نے ایک جوتا ایسا کھینچ کر مارا کہ مرزا کے منہ پر لگا۔ اس دن کے بعد مرزا نے دکان پر سامنے کے رخ بیٹھنا چھوڑ دیا۔ مرزا حیرت کے انتقال کے بعد ان کا نایاب اور قیمتی کتب خانہ لال کنوئیں پر ایک کباڑیے کے ہاں برسوں کوڑیوں کے مول بکتا رہا۔

دلّی کی یاد آئی تو دلّی کی وضع دار ہستیوں کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان کا تذکرہ زلفِ یار کی طرح دراز ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ یا اسے شبِ فراق کی درازی سے مشابہ سمجھیے۔ آنکھیں اب ان صورتوں کو ڈھونڈتی ہیں اور ماضی کے دھندلکے میں نظریں بھٹک کر مایوس لوٹ آتی ہیں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

نہال سیوہاروی

ایک دن ایک صاحب ملنے آئے۔ دبلے پتلے، سانولا رنگ، عمر تیس سال، ڈاڑھی مونچھ صاف، چہرے پر ناک ذرا ضرورت سے زیادہ نمایاں، شیروانی اور علی گڑھ فیشن کا پاجامہ۔ مسکراتے لجاتے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نہال سیوہاروی ہیں۔ ان کا کلام کبھی پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ کسی سے ان کا نام ہی

darulkutub.blogspot.com

سُنا تھا۔ ساقی کے لیے اپنا کلام مجھے دیا۔ مَیں نے پڑھا، پھر انھیں غور سے دیکھا۔ بڑا جان دار شعر کہتے تھے۔ مَیں نے کہا "شائع ہو جائے گا۔" وہ مُسکرا کر چلے گئے۔ ساقی شائع ہُوا تو پھر آئے۔ پرچہ لیا اور کچھ کلام دے گئے۔ پھر انھیں سائل صاحب کے ہاں دیکھا اور مشاعروں میں پڑھتے ہوئے بھی سُنا۔ بہت بُرا پڑھتے تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے مگر کچھ اس طرح ہونٹ چبا کر اور چِلّا کر کہ دیکھ کر ہنسی آتی۔ اور جوش سے مُنھ سے تھوک بھی اُڑنے لگتا تھا۔ پھر نہ جانے کس کے مشورے سے ترنم سے پڑھنے لگے اور بھی مٹی پلید ہو گئی۔

اس عرصے میں نہال سے خاصا تعلقِ خاطر ہو گیا تھا اور گھنٹوں اُن سے باتیں ہوتی تھیں۔ ترقی پسند تو اب پیدا ہوئے ہیں، نہال ہمیشہ سے ترقی پسند تھا۔ اس کے اشعار میں جوانی کی ترنگ تھی۔ وہ جوش و خروش کا شاعر تھا۔ غزل بھی کہتا تو روایتی بے ہودگی اور نامردی سے پاک۔ نظم میں سوائے جوش ملیح آبادی کے اور کسی کا کلام اُس کے آگے نہیں ٹھہرتا تھا۔

جوش صاحب جب دِلّی آ کر رہے اور انھوں نے کلیم جاری کیا تو دِلّی کے ادبی حلقے میں جان پڑ گئی۔ جوش نہال کے بے حد مدّاح تھے۔ جس دِن نہال اُن کے ہاں نہ جاتے، جوش شام کو نہال کے گھر پہنچ جاتے اور انھیں وہاں سے لاتے۔ کُتب خانۂ علم و ادب شہر کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بن گیا تھا۔ شام کو سب اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر کتب خانے پہنچ جاتے۔ مرزا فہیم بیگ چغتائی کے لطیفے ہوتے۔ نہال اور نابش کی غزلیں ہوتیں۔ ظفر قریشی، صادق الخیری، فضل حق قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدّین اور سب ہی ہر روز کے آنے والوں میں تھے۔ ان میں ادبی گفتگو ہوتی، نوک جھونک ہوتی۔ کبھی ایک کو نقلِ محفل بنا لیا جاتا۔ خوب ہنسی ہوتی۔ چائے پی جاتی، جی چاہا تو کچھ کھایا بھی جاتا۔ اور دو گھنٹے بعد یہ اجتماع ختم ہو جاتا۔ نہال بڑا مرنجاں مرنج انسان تھا۔ مزاج میں کچھ حُسن پرستی بھی تھی اس لیے اکثر نزلہ اسی غریب پر گرتا تھا۔ مگر وہ اللہ کا بندہ ہنستا ہی رہتا۔ ایک دن اپنے سے بھی مُٹھی بھر اُونچا نوجوان ساتھ لیے ہوئے آئے۔ ہم سمجھے نہ کوئی دوست ہوگا۔ نہال کے ساتھ اس پر بھی دو چار فقرے ہوئے۔ نہال بہت سٹ پٹائے اور خلافِ معمول جلدی چلے گئے۔ اگلے دن آئے تو اخلاق احمد نے خبر لی۔ نہال نے بڑی

عاجزی سے کہا۔ "میرا بڑا لڑکا تھا۔ مَیں نے سوچا تم کچھ اور نہ کہہ بیٹھو۔ اِس لیے جلدی چلا گیا۔"

نہال بڑے صبر و ضبط کا آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر ریلوے کے دفتر میں کلرکی کی۔ تنگی تُرشی میں عمر بسر کی مگر کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ زمانہ سازی اور مکھن بازی سے اُسے نفرت تھی۔ وہ ایک بڑے مشاعرے میں محض اس لیے شریک نہیں ہُوئے کہ اُس کی صدارت ایک گورنر صاحب کر رہے تھے۔ اس مشاعرے سے اُسے سو پچاس روپے ملنے والے تھے مگر وہ نہ مانا۔ شاہینی صفات کا آدمی تھا۔ افلاس کی وجہ سے ظاہر بینوں نے اُسے حقیر جانا۔ وہ ایک خوددار شاعر تھا اور اپنا ڈھول آپ پیٹنے کا فن اُسے نہیں آتا تھا۔ اس نے زندگی کی سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور زندگی نے اُس سے یُوں انتقام لیا کہ اسے ہمیشہ مُفلس ہی رکھا۔ کماتا دھماتا کڑیل جوان بیٹا مرا۔ اُس کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کا دِل مر گیا۔ مگر وہ زندگی سے لڑتا ہی رہا۔ اُس کی رُوح لہولہان ہو گئی تھی مگر اُس کی پیشانی پر کوئی شکن تک نہیں تھی۔ وہ اسی طرح مُسکراتا رہتا تھا، ہنستا تھا اور قہقہے لگاتا تھا۔ جس طرح اب سے بائیس سال پہلے۔ اور ایک مہینہ ہُوا ایک دم سے سُنا کہ نہال مر گیا۔ مختصر سی علالت کے بعد اُسے ہسپتال میں داخل کیا گیا مگر وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ اور زندگی نے آخر اُسے قبل از وقت موت کی نیند سُلا ہی دیا۔[1]

---

[1] میر باقر علی، خواجہ ناصر نذیر فراق، نواب سائل اور مرزا حیرت سے متعلق خاکوں کے کچھ اجزا ۱۹۵۲ء میں اور کچھ ۱۹۵۱ء میں لکھے گئے۔ اس مضمون کے باقی تمام خاکے ۱۹۵۸ء میں قلم بند ہوئے۔

qasarulkutub.blogspot.com

شاہد احمد دہلوی کے بارے میں

نام .. .. شاہد احمد

پیدائش .. .. دہلی - ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء

تعلیم .. .. { بی اے (آنرز) ۱۹۲۵ء میں میڈیکل کالج لاہور چھوڑ کر دہلی میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے بی اے (آنرز) کیا۔ }

شادی { ۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء میں عاتیہ بیگم سے پہلی شادی ہوئی

شادی .. .. ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں عاصمہ بیگم سے شادی ہوئی۔ }

"ساقی" کا اجرا .. .. جنوری ۱۹۳۰ء

ہجرت .. .. ۲۳ ستمبر ۱۹۴۷ء دہلی سے لاہور آئے۔

لاہور سے کراچی .. .. مئی ۱۹۴۸ء میں لاہور سے کراچی آ گئے۔

کراچی سے "ساقی" کا اجرا .. .. ستمبر ۱۹۴۸ء

ریڈیو پاکستان کی ملازمت ۱۹۴۸ء

پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی .. .. جنوری ۱۹۵۹ء

{ یونیسکو کی طرف سے تھائی لینڈ اور فلپائن کا ثقافتی دورہ اور سفر جاپان و ہانگ کانگ } اپریل ۱۹۵۹ء

ادبی خدمات پر صدارتی انعام ۱۹۶۳ء

وفات .. .. ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء - کراچی

قبر .. .. سندھی قبرستان - کنٹری کلب روڈ - کراچی۔

تصانیف

گنجینۂ گوہر .. .. ۱۷ شخصیتوں پر سوانحی خاکوں کا مجموعہ

دلّی کی بپتا .. .. ۱۹۴۷ء میں دلّی کے خونی غسل کا رپورتاژ

اُجڑا دیار .. .. دلّی پر مضامین کا مجموعہ

تراجم (ناول - افسانے - ڈرامے - نفسیات وغیرہ)

فاؤسٹ (ڈراما) .. .. گوئٹے کے ڈرامے کا ترجمہ

نرگسِ جمال (ڈراما) .. .. ماترلنک

پروین و ثریا (ڈراما)

حیرت ناک کہانیاں (افسانے) ہاتھورن کی کتاب "اے ونڈر بک" کا ترجمہ

انوکھی کہانیاں (افسانے) .. " " "ٹینگل وُڈ ٹیلز" کا ترجمہ

دھان کا گیت (ناول) .. .. آئی لن چانگ کے ناول "رائس اسپراؤٹ سونگ" کا ترجمہ

عثمان بطور (ناول) .. .. ترجمہ

سرگزشتِ عروس (ناول) .. .. ترجمہ

پھانسی (ناول) .. .. .. ترجمہ

غریب لڑکے جو نامور ہوئے .. (سوانح) بولٹن کی کتاب "لائیوز آف پُور بوائز ہُو بی کیم فیمس" کا ترجمہ

آپ کے بچے کی صحت .. .. (صحت وطب) گالاگھیر کی کتاب "یور چلڈرنز ہیلتھ" کا ترجمہ

کامیاب باپ (بچوں کی نفسیات) "اے گائیڈ ٹو سکسیس فل فادرہڈ" کا ترجمہ

بچوں کے جذباتی مسائل (" " "ایموشنل پرابلمز آف گروئنگ اپ" کا ترجمہ

بچوں میں جذبۂ عداوت (") ایسکیلونا کی کتاب "ہوسٹیلٹی اِن چلڈرنز" کا ترجمہ

والدین اور معلمین (بچوں کی نفسیات) گرانٹ کی کتاب "پیرنٹس اینڈ ٹیچرز ایز پارٹنرز" کا ترجمہ

بچوں کے کھیل (" ") گرا سیمبن کی کتاب "ہاؤ چلڈرن پلے" کا ترجمہ

انتخابِ معاش (" ") ہمفریز کی کتاب "ہیلپنگ یوتھ چُوز کیریئرز" کا ترجمہ

بچوں کی جنسی تعلیم (" ") کرکینڈل کی کتاب "ہیلپنگ چلڈرن انڈرسٹینڈ سیکس" کا ترجمہ

qasrulkutub.blogspot.com

۔بچوں کی دلچسپیاں (بچوں کی نفسیات) کمبوڈر کی کتاب "ایکسپلورنگ چلڈرنس انٹرسٹس" کا ترجمہ۔

خود شناسی (بچوں کی نفسیات) مینگر کی کتاب "سیلف انڈرسٹینڈنگ" کا ترجمہ۔

بچے کی اخلاقی قدریں (" ") مانٹیگو کی کتاب "ہیلپنگ چلڈرن ڈیولپ مورل ویلیوز" کا ترجمہ

آپ کے بچے کی وراثت (") نیوگارٹن کی کتاب "یور چلڈرنز ہیریڈٹی" کا ترجمہ

۔بچوں کی نشو و نما (بچوں کی نفسیات) اولسن کی کتاب "ہاؤ چلڈرن گرو اینڈ ڈیولپ" کا ترجمہ

۔بچوں کی سیکھنے کی قابلیت بڑھانا (بچوں کی نفسیات) ریولن کی کتاب "امپرووننگ چلڈرنز لرننگ ایبلیٹی" کا ترجمہ

۔بچوں کے خوف (بچوں کی نفسیات) راس کی کتاب "فیرز آف چلڈرن" کا ترجمہ

۔بچوں کی معاشرتی زندگی (بچوں کی نفسیات) ولیتسمین کی کتاب "گائیڈنگ چلڈرنز سوشل گروتھ" کا ترجمہ

معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی (بچوں کی نفسیات) لینڈس کی کتاب "ہیلپنگ چلڈرن ایڈجسٹ سوشلی" کا ترجمہ۔

بچوں کی بدتمیزیاں (بچوں کی نفسیات) لیونارڈ کی کتاب "وہائی چلڈرن مس بی ہیو" کا ترجمہ۔

ان کے علاوہ افسانے، ڈرامے، ناولٹ وغیرہ کے تراجم ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کو بھی مرتب و شائع کرنے کی ضرورت ہے۔